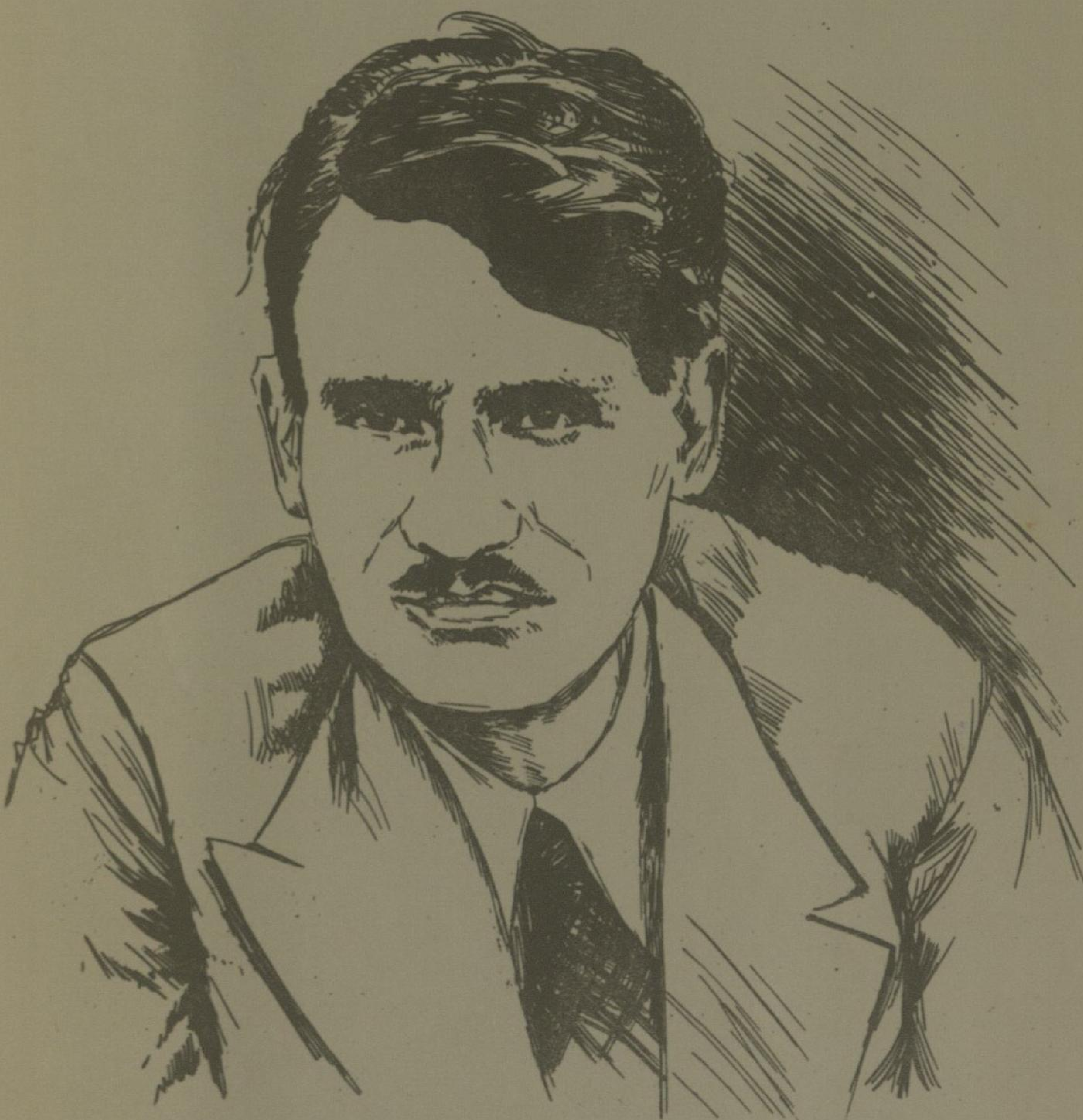
بے زبان

سیّد رفیق حسین





ترتیب

نمبر شمار

نہ قصہ نہ کہانی

ناشر: میجر جنرل سید شاہد حامد (ریٹائرڈ) "سید امیر کلال اکیڈمی" گنج شائگان ہائتھ لائنز، راولپنڈی

قیمت: ۳۵ روپے

میرے چچا!

کسی ایسے شخص کے متعلق کچھ لکھنا جس کے لئے دل میں محبت اور احترام ہو خاصہ مشکل ہے پھر اتفاق سے اگر وہ آپ کا اپنا چچا ہو تو جذبات اور تاثرات کا اظہار اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ وہ میرے چچا تو ضرور تھے مگر ان کی اور میری عمر میں کچھ ایسا لمبا چوڑا فرق نہیں تھا۔ اس لئے وہ میرے چچا ہونے سے کہیں زیادہ میرے دوست اور معتمد ساتھی تھے۔

ہم ایک دوسرے کو کم ہی دیکھ سکے کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ملازمت سے دوسری ملازمت کی دوڑ بھاگ میں سرگرداں دور دراز مقامات میں گرم سفر رہے جبکہ میرے لئے ملاقاتوں کی راہ میں پہلے میری تعلیم پھر ملازمت حائل رہی۔ میرے اور ان کے درمیان شکار کا شوق قدرے مشترک تھا۔ ہم دونوں ان شکار پارٹیوں میں جو چھٹیوں میں ترتیب دی جاتی تھیں شریک ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر میں اور وہ ایک ہی خیمے میں رہتے اور زمین پر بچھونا بچھا کر سوتے تھے ایسے ہی وقتوں میں وہ ان چیزوں کے متعلق جن سے مجھے اور انہیں دلچسپی تھی اور ان لوگوں کے متعلق جنھیں ہم مشترک طور پر جانتے پہچانتے تھے کھل کر باتیں کرتے۔ یادوں کی زنجیر مجھے ان بے تکلف گفتگوؤں کی طرف لیجا رہی ہے جو میرے اور ان کے مابین ہوتی رہی تھیں۔ میں چاہتا ہوں ان باتوں کی روشنی میں اپنے چچا کی شخصیت کے نقوش کاغذ پر ایسے اتاروں جیسا میں نے انہیں اس وقت دیکھا تھا یا بعد میں جب اپنی تحریروں کے وسیلے سے انہوں نے نام پیدا کیا۔ میرے پاس ان کی باقیات میں صرف ایک خط ہے جس کا ترجمہ میں اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ میرے چچا کے تعلقات میرے ساتھ برادرانہ انداز کے تھے جبکہ میرے والد یعنی ان کے بھائی کے ساتھ ان کے رسمی انداز کے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد اس بات کے خواہاں تھے کہ وہ ایک نارمل و عملی زندگی گزاریں اور یہی بات ان کے کردار اور مزاج کی برعکس تھی۔ اگر کوئی ملازمت ان کے مزاج کے مطابق نہ ہوتی تو وہ اسے فوراً چھوڑ دیتے اور گھر واپس آکر جو کچھ روپیہ ہاتھ میں ہوتا بیوی کی مٹھی میں تھما دیتے اور ان سے استدعا کرتے کہ جب تک اس رقم سے گھر چلایا جا سکے چلاؤ۔ پھر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد چند ماہ اپنی دلچسپی کے موضوعات کے مطالعہ اور فہم و دانش کے حصول میں لگا دیتے۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ دماغ رکھتے تھے ان کا پیشہ انجنیئری تھا مگر اس فن میں ایک خاص موضوع پر اپنا دماغ لگانے کے بجائے وہ چہار سمت سے اس وسیع و عریض میدان میں تگ و تاز شروع کر دیتے۔ یعنی یہ ایک جہاز کی چیف انجنیئری سے لے کر ایک شوگر فیکٹری کی تنصیب تک کے تمام مرحلوں سے ہم نے انہیں گزرتا دیکھا وہ اپنی زندگی میں صد تجربات کرتے رہے ان کا دماغ شئے

خیالات اور تصورات کا ایک بوقلموں خزینہ تھا اور ایک وقت آیا کہ ان خیالات کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ رہا اور آخر ان کے اظہار کی صورت افسانوں کے وسیلے سے پیدا ہوئی۔ انہیں جانوروں سے بڑی محبت تھی اور شکاروں اور جنگلوں سے قرب نے انہیں ان کا بڑا نبض شناس بنا دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جانوروں کی نفسیات کی باریکیوں تک خوبی سے رسائی حاصل کر لی جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا مجھے اور چچا کو شکار کا بہت شوق تھا۔ وہ شیر کو زمین سے مار سکتے تھے ان کا نشانہ بہترین تھا انہوں نے ایک گلدار ڈیڑھ سو گز سے چلتے پھرتے مار لیا تھا انہیں جانوروں سے کوئی دہشت نہ آتی تھی۔ مگر ایک مرتبہ خوف اور دہشت نے انہیں دبوچا تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب وہ چیونٹیوں کے ایک بل کے پاس جنگلی مرغی کو شکار کرنے کیلئے نشانہ لے رہے تھے عین اس وقت جب وہ نشانہ باندھ رہے تھے انہیں اپنے بائیں گال پر گرم سانس محسوس ہوئی انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ان کی آنکھیں شیر کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیر ڈرا یا وہ ڈرے، بہرحال چونکہ شیر آدم خور نہیں تھا اس لئے وہ اس جگہ سے ٹل گیا۔ اور یہ سکتے میں کھڑے رہ گئے۔ اس واقعہ کا تاثر کئی ماہ تک ان پر رہا۔ شیر کی خو کو سمجھنے کے سلسلے میں انہوں نے اپنے افسانوں میں خاصہ کچھ لکھا ہے۔ یہ سب ان کے وسیع تجربات کی سچی تصویریں ہیں۔ اکثر واقعات انہیں خود پیش آئے مگر بہرحال جانوروں کی نفسیات سے بھی کہیں زیادہ عدم اور وجود سے متعلق ان کے وہ فلسفیانہ افکار میں جو ہر قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ بڑی سعادت ہے کہ میں اپنے مرحوم چچا کے فراموش کردہ افسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے قدم اٹھا رہا ہوں۔ آگے ادب کے قارئین و ناقدین کا حصہ ہے وہ اس کام کو مزید آگے بڑھا سکتے ہیں اور انہیں ان کا جائز مقام دلا سکتے ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ پڑھنے والے اپنے خیالات سے مجھے آگاہ کرنے میں بخل سے کام نہ لیں گے۔ خدا کرے یہ سعی مشکور ہو۔

خاکسار

سید شاہد حامد

میجر جنرل (ریٹائرڈ)

ترجمۂ خط سید رفیق حسین

بنام سید شاہد حسین

ڈیر شاہد!

تمہارا خط ملا۔ میرے لئے اور میرے کاروبار کے لئے تمہارے خیال اور فکر کا ممنون ہوں۔ ہاں اس سال میں نے اس میں بہت کچھ لگا دیا ہے۔ مگر سعدی کے صرف دو مصرعے .... لیکن شاید تمہیں فارسی نہیں آتی اس لئے میں نے یہ مصرعے نہیں لکھے، لیکن ان میں جو خیال ہے اُسے سمجھائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ سکندر جنگل میں شکار کرتے ہوئے راستہ بھول گیا، اور بالکل تنہا رہ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ ناگاہ ایک پیرِ مرد نظر آئے۔ "تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ اس نے پوچھا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، سکندر بڑا دانا شخص تھا۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو خواجہ خضر ہیں اس نے کہا" مہربانی سے مجھے آبِ حیات تک پہنچا دیجئے میں جانا چاہتا ہوں۔ تو خواجہ خضر نے انہیں چشمۂ آبِ حیات تک پہنچا دیا۔ (یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کا پانی کوئی ذی حیات اگر پی لے تو اسے حیات ابدی مل جاتی ہے) اس چشمہ پر پہنچکر سکندر نے بڑا دلدوز منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ بیسوں لوگ ایسے ہیں جن کے نصف جسموں کو کیڑے کھا چکے ہیں۔ کچھ بہت ہی ضعیف و نحیف ہیں، کچھ کے دانت اعضاء تک جھڑ گئے ہیں صرف کھوپڑیاں باقی ہیں ان میں زیادہ تر موت کی دعائیں کر رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کے لئے موت نہیں ہے — چنانچہ اس چشمے سے ایک قطرہ بھی پیئے بغیر سکندر واپس لوٹ آیا مگر اپنی بقیہ تمام زندگی وہ کفِ افسوس ملتا رہا کہ اس نے اس چشمہ کا پانی کیوں نہ پیا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ خدا ایک کامل رہبر نہیں اچھی تقدیر دے — آہ، شکار یا چکار کچھ بھی نہیں۔ میں مرزا پور گیا تھا مگر چونکہ تم موجود نہیں تھے۔ وہ چند دن جو میں وہاں رہا۔ سُو سُو کر کاٹ دیئے۔

تم سے محبت کرنے والا

رفیق

گُلِ صحرا

• ـــــ فضل قدیر

سید رفیق حسین مرحوم کا نام قارئین کی اس نسل کے لئے جو اب ادھیڑ ہو چکی ہے۔ جانا پہچانا ہے، لیکن وہ جواں سال ادیب اور پڑھنے والے، جنہوں نے اس سرزمین میں ہوش سنبھالا ہے، ان کے نام سے ناآشنا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رفیق حسین مرحوم کی نگارشات کو شایانِ شان اشاعت کے سامان کبھی فراہم نہ ہو سکے۔

آزادیٔ وطن سے صرف چند سال قبل کی بات ہے کہ سُتے ہوئے چہرے، اُلجھے بالوں گھری، گہری، تھکی ہوئی نگاہوں والا کھویا، کھویا ایک افسردہ خاطر جوان بوڑھا راجپوتانہ کی بھول بھل میں لوٹتے لوٹتے ادب کے سبزہ زار میں آن گھُسا۔ گرانڈیل ادیبوں نے اس نووارد کی طرف سے تمکنت سے آنکھیں پھیر لیں، خود نووارد کو بھی مُدّت تک یہی گمان رہا کہ یہ سبزہ زار نہیں سراب ہے۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے اور خواب زیادہ تر واہمہ ہی ہوتے ہیں ان کا اعتبار کیا.... لیکن پھر ریت کے وسیع سمندر میں دھیرے دھیرے تموّج پیدا ہوا۔ جب بات دائرۂ خاص سے ہٹ کر عوام کے ہونٹوں پر آجائے تو سمجھیۓ کوٹھوں چڑھ جاتی ہے اور اس کے آگے پھر کوئی ٹھہرتا نہیں۔

راجپوتانہ کے ریگزار سے بھوسلے کاغذوں کا وہ میلا سا پلندہ جو حسنِ تقدیر سے ردّی کی ٹوکری کی نظر ہوتے ہوتے جب رسالہ ساقی کے اُفق پر "کفارہ" کے عنوان سے طلوع ہُوا تو گدڑی کے لعل کی طرح چمک اٹھا۔ ہر طرف سے مکرّر مکرّر کی صدائیں بلند ہونی شروع ہو گئیں اور ہر عمر اور ہر خیال کے پڑھنے والوں کا تقاضا تھا کہ ان صاحب سے کہیئے کہ اور

لکھیں۔ واہ کیا بات ہے۔!

ادب کے گرانڈیل چودھریوں نے اپنی عینکوں کے شیشے صاف کئے اور واقعی نووارد کو غور سے دیکھا۔ اور نووارد نے شوگرمل کی کھٹ کھٹ دھڑ دھڑ کے شور میں پلاس اور پیچ کش کے ساتھ ساتھ قلم بھی پکڑنا شروع کر دیا جو کچھ لکھا وہ ہاتھوں ہاتھ گیا اور اُن کی جانب سے مزید کا نعرہ گونجتا رہا۔

سید رفیق حسین سوز و ساز کا ایک جیتا جاگتا مرقع تھے وہ وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے اور کرمکِ شب تاب کی طرح جودتِ تخلیق کی آتشیں لَو میں سلگ کر خاکستر ہو گئے۔ فنکار ہونے کا یہی کفارہ تھا........

سید رفیق حسین نے لکھنؤ کے محلے شاہ گنج میں آج سے نصف صدی قبل آنکھیں کھولیں، ان کے والد خان بہادر سید جعفر حسین موسوی محکمۂ انہار کے چیف انجینئر تھے۔ یہ صوبجات متحدہ کے پہلے مسلمان تھے جس نے رڑکی سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، رفیق حسین کے دادا سید محسن علی محسنؔ ایک پرگو شاعر۔ اہلِ دل صوفی۔ اور قلندر منش انسان تھے۔ مشہور تذکرہ "سراپا سخن" ان کی تصنیف ہے۔ سید صاحب کے پردادا سید حسین شاہ حقیقت بھی ایک مقتدر عالم اور ماہرِ علوم اللسنہ تھے، سادات کا یہ گھرانہ عہد فرخ سیرؔ میں بلخ سے ہندوستان آیا تھا۔ اور ان کے مورثِ اعلیٰ سید امیر کُلال تھے جن کا شمار صوفیائے کبار میں ہوتا ہے۔ سید رفیق حسین مرحوم کو ان باتوں کا قطعی علم نہیں تھا اور یہ ان کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ وہ ایک خود رو صحرائی پھول کی طرح رہے جس پر تکلف و تصنع کا کوئی ملمع تھا نہ خاندانی تفاخر کا کوئی خول۔

سید رفیق حسین مرحوم کا جو پہلا نقش میرے ذہن پر مرتسم ہے وہ انتہائی دُھندلا ہو چکا ہے۔ میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ لکھنؤ کے محلے بلوچ پورے میں ایک تہہ خانے والا مکان تھا۔ یہ میری بڑی خالہ سیدہ آفاق بیگم کا گھر تھا اور اس سے ملے ملے بہت سے عزیزوں کے گھروندے تھے جو مختصر کھڑکیوں اور دروازوں سے ایک دوسرے سے ملتی تھے۔ یہیں میں نے پہلی بار سید رفیق حسین مرحوم کو دیکھا۔

مجھے بتایا گیا کہ دیکھو یہ تمہارے ماموں جان ہیں..... مگر وہ جو میرا ماموں جان تھا کچھ عجیب سا آدمی نکلا..... اُسے مجھ پر توجہ دینے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ چھرڑ جیسا لمبا قد، سُتا ہُوا گورا بھبوک چہرا اور بئے کے جھونجھ کی طرح الجھے ہوئے لمبے لمبے بھورے بال، بڑھے ہوئے ناخن اور میلی بنیان۔! مضطرب اور بے چین آنکھیں اِدھر اُدھر گھُماتے ہوئے وہ بیڑی کے لمبے لمبے کش لے کر انجن کی طرح دھواں اُڑا رہے تھے۔ بیڑی کے تیز دھوئیں نے چراندسی فضا میں پیدا کر دی تھی۔

سیّد رفیق حسین کی دوسری جھلک کچھ عرصے بعد پھر اسی گھر میں دیکھی۔ بڑی بوڑھیوں کو کہتے سُنا "لو وہ باؤلے آگئے ہیں" سارا دن ہو گیا ہے اور کمرے میں بند تصویریں بن رہی ہیں۔

شام ڈھلنے پر کسی لڑکی نے بند کمرے کے دروازے دھڑ دھڑانا شروع کئے۔ مگر دروازے نہیں کھلے۔ اگلے دن دوپہر کے قریب جب کمرے کے دروازے کھلے تو اُلجھے ہوئے بھورے بالوں والا ایک انسان کمرے سے نکلا اور برآمدے میں گر پڑا۔ سارے گھر میں ہلچل مچ گئی..... کسی نے ٹانگیں دبانا شروع کیں۔ کسی نے سر جھنجھوڑا، تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو انہوں نے کراہنا شروع کر دیا۔ اور کچھ بوڑھی عورتوں نے ان پر سخت ملامت شروع کر دی۔ خاک پڑے اس تصویر پر۔!

ہم بچے جب دوڑ کر کمرے کے اندر گھسے تو سامنے ایک بہت بڑے تختے پر ایک تصویر نظر آئی یہ ایک گھنے جنگل کی تصویر تھی جس میں بارہ سنگھے گھاس چر رہے تھے۔ سامنے مٹی کی پیالیوں میں کپڑے رنگنے کے رنگ اور بیسیوں چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ اب پتہ چلا کہ آپ سارا دن ساری رات تصویر بنانے میں منہمک رہے تھے اور اس مشقت نے اب پلنگ نشین کر دیا تھا۔

تیسری بار انہیں اپنے گھر واقع دین دیال روڈ پر دیکھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آپ نے میری چھوٹی بہن سے جو پہاڑے یاد کر رہی تھی، پوچھا "کیا کر رہی ہو؟" اس نے کہا پہاڑہ یاد کر رہی ہوں۔ آپ نے کہا "تمہیں معلوم ہے پہاڑہ کسے کہتے ہیں؟" اُس

نے حیران ہو کر کہا "پہاڑہ تو میں یاد کر رہی ہوں"۔ آپ نے جھٹ پاس پڑی ہوئی لکڑی اٹھالی اور کمر ٹیڑھی کر کے لکڑی کے سہارے چلنا شروع کر دیا اور پھر لکڑی ہوا میں لہرا کر بولے "یہ ہے پہاڑہ۔ اس کی مدد سے کھٹ کھٹ پہاڑ پر چڑھا جاتا ہے۔

پھر چوتھی بار انہیں علی گڈھ میں اپنی ایک خالہ کے یہاں دیکھا۔ یہاں ایک بندر پلا ہوا تھا آپ اس کے سامنے بیٹھے اُسے منہ چڑا رہے تھے اور بچے ان کے گرد گھیرا ڈال کر ہنس رہے تھے۔

علی گڈھ والی ملاقات کے بعد انہیں دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے مواقع ذرا جلد جلد آنے لگے۔ یہ ہی وہ زمانہ تھا جب انہوں نے جانوروں کی کہانیاں لکھنے کا شغل اپنا لیا تھا اور رسالہ "ساقی" میں ان کے افسانے باقاعدگی سے شائع ہوتے شروع ہو گئے تھے۔ وقت کے اس موڑ پر آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور ان کے متعلق والدہ سے بہت کچھ کریدنے لگا تھا۔

میرے کانوں میں ان کی شخصیت کے متعلق طرح طرح کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ یہ نہایت نیک آدمی ہے۔ پر بس ایک مرض بہت بُرا ہے۔ اور وہ ہے "استعفٰی"۔ ہر چوتھے مہینے اگر استعفٰی نہ دے تو بہت بڑا آدمی ہو سکتا ہے!

بڑی بوڑھیوں کو کہتے سنا کہ "رفیق کی ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔ ذرا سی بات پر انگریز افسر کو تھپڑ مار دیا۔ اب بھلا ان گُوتکوں سے نوکری رہ سکتی ہے بھلا"!

رفتہ رفتہ عمر کی منزلوں کے ساتھ میں ان سے زیادہ قریبی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کے افسانوں کو کئی بار پڑھا کچھ ان سے سمجھنے کی کوشش کی اور کچھ خود سمجھا۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ یہ شخص نوکریاں چھوڑنے کا شوقین نہیں ہے اور نہ اہلِ خاندان سے لاپرواہ ہے۔ بلکہ یہ شخص جنون کی حد تک ایمانداری کے مرض میں مبتلا ہے اور اس کی دیانت ہی اس کی ناکامی کی وجہ ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ شخص بنیادی طور پر متصوفانہ خیالات کا حامل ہے۔ کائنات پر غور کرنے کا عادی ہے طبیعت میں بے چینی اور تجسس ہے، جودتِ تخلیق کا شعلہ سا اندر لپکتا رہتا ہے جو کل سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ شخص جو بندروں کو منہ چڑانے اور بچوں کو چرا کر امرود توڑنے کے گُر بتانے کا ماہر تھا۔ سچا دیندار اور خدا پرست بھی تھا۔ میں نے ایک بار انہیں اپنے حج کا احوال بتاتے ہوئے رقت سے روتے بھی دیکھا ہے۔ سید صاحب نے ابتدائے جوانی میں ایک جہاز پر ملازمت کر لی تھی۔ یہ جہاز جب جدہ پر لنگر انداز ہوا تو پتہ چلا کہ حج کا زمانہ ہے چنانچہ آپ جہاز سے کود حاجیوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ مدینہ کی زیارت کا احوال بڑے رقت انگیز الفاظ میں سُنایا کرتے تھے۔

سید صاحب زندگی بھر حالتِ سفر میں رہے۔ کبھی رُوح کی ناآسودہ تمناؤں کی اذیت میں گرفتار۔ کبھی عرفان و الہام کی برق کا شکار۔ شعلۂ تخلیق ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ روح اظہار کے لئے تڑپتی تھی۔ تصویر کشی کی کیفیتیں اس کی واضح مثال ہیں۔ اللہ بخشے انسان گزیدہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے جانور انسانوں سے زیادہ انسان ہیں۔۔۔۔ وہ کہا کرتے تھے انسان بڑا خوفناک جانور ہے۔ یہ لیگ آف نیشنز، یہ امن و آشتی کے آدرش سب ڈھکوسلے ہیں۔ وہ جانوروں کی معصومیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انہیں مشیت کے انگھڑ کھلونے تصور کرتے تھے جو انجانے انداز میں حیات کا کفارہ بڑی مسکینی سے ادا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ ماموں جان مر گئے ہیں اور مجھے آج تک یقین نہیں آیا کہ کفارہ، کلوا، بیرد، گوری ہو گوری جیسے افسانے لکھنے والا کیسے مر سکتا ہے؟

سید صاحب کی کہانی خود اُن کی زبانی

جھوٹا ہوں سچا ہوں دیوانہ یا سنکی
جو کچھ بھی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں

خدایا سب سے پہلے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اس آپ بیتی کے تحریر کرنے میں میری مدد کر تجھ میں بڑی قدرت ہے مجھ ایسے جاہل کے قلم میں روانی پیدا کر دے۔ بیانات میں سادگی دے تاکہ ہمت اور صداقت سے بلاتعصب۔ صحیح صحیح وہی حالات بیان کر سکوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اس سے آگے مجھے کچھ درکار نہیں۔ پڑھنے والے سچ سمجھیں یا نہ سمجھیں مجھے مطلق پرواہ نہیں بلکہ اصلیت تو یہ ہے کہ میں خود بھی آپ بیتی کے ایک ایک دن اور ایک ایک گھڑی کو یاد کرتا ہوں اور پھر مشکوک ہو جاتا ہوں۔ اس ماجرے کی اصلیت کو تو بس خدا ہی جانتا ہے۔ کم سے کم میری عقل تو کام نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ اس افسانے کے پڑھنے والوں میں سے کوئی تہہ کو پہنچ سکے۔ اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔

میرا وطن لکھنؤ ہے اور ۱۸۹۴ء کی میری پیدائش، شائد میری عمر ۷ یا ۸ برس کی تھی جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا اس زمانہ میں والد صاحب مرحوم جناب خان بہادر سید جعفر حسین صاحب گوالیار میں اسٹیٹ انجنیئر تھے۔ یوپی گورنمنٹ سے عارضی طور پر ریاست گئے ہوئے تھے۔ والدہ کے انتقال کے بعد ہم سب یعنی مجھ سے ایک برس بڑی بہن۔ میں اور مجھ سے ایک برس چھوٹی بہن ایک عرصہ تک رشتہ داروں کی چھین جھپٹ کے واسطے کھلونا بنے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کامل چار برس الف بے ہی یاد کرتے گزر گئے اور یہ یاد نہ ہوئی۔ خدا پھپھی اماں کو غریقِ رحمت کرے ایک دفعہ ان کا بھی داؤں چل گیا ہم سب کو دبوچ لکھنؤ میں لے بیٹھیں۔ صبح سات بجے تک اور پھر ایک بجے سے شام کو چراغ جلے تک رحل پر نچا کھچا (نہ معلوم اس زمانے کی کتابوں کو کیا ضد تھی کہ تیسرے ہی دن پارہ پارہ ہو جاتی تھیں) بغدادی قاعدہ رکھا ہے۔ گھری کھٹیا پر بیٹھے ہل رہے ہیں اور آں نکم۔ با بین نکم چلا رہے ہیں۔ لمبے برآمدے کے ایک سرے پر ہم ہیں دوسرے سرے پر ستر برس کی مفلوج دادی اماں کا کھٹولہ ہے جس پر وہ ایک گٹھری کی طرح پڑی ہیں۔ اور پانچ پانچ منٹ کے بعد برابر یہ ہی کہتی ہیں "اری بفیتہ کچھ دے گی ؟ ڈلی۔ تمباکو۔"

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد چھوکری بفاتن آکر مٹھی بھر ڈلی کا چورا اور تمباکو ان کے منہ میں بھر جاتی تھی۔ دو منٹ نہ گزرتے تھے کہ پھر اس چوگے کو تھوک تھاک وہ اپنا سبق شروع کر دیتی تھیں تو اس طرح اس برآمدے میں ہم ہی دو تھے جو دن بھر اپنی جینی جپا کرتے تھ مجھ سے ایک بڑی اور دوسری مجھ سے ایک برس چھوٹی بہنیں بھی صبح شام یہاں پڑھتی تھیں لیکن ان کے کاروبار شاہانہ تھے ایک قرآن دھرا رہی تھیں۔ دوسری ختم کر رہی تھیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھا اور آواز دی پھوپی اماں سن لیجئے۔ انہوں نے کمرے میں سے پان دھوتے ہوئے جواب دیا سناؤ۔ چونکہ خود حافظِ قرآن تھیں ایک آدھ جگہ ٹوکا۔ اور کہا ایک بار دھرالو اور چھٹی کرو۔ تھوڑی دیر میں یہ دونوں چل دیں، ہم رہ گئے اور دادی اماں۔ وہ آہستہ آہستہ پڑھتی تھیں۔

"اری بفتیہ کچھ دے گی ؟ ڈلی ؟ تمباکو ؟" اور ہم ازار بند کے سروں سے تو کھیل رہے ہیں او

زبان سے جھپا جھپ کہہ رہے ہیں۔ ”تا تن نکم با بن نکم“ کیا مجال کہ ہماری یا دادی اماں کی زبان بند ہو جائے۔ اگر وہ سوتی بھی تھیں تو پھوپی اماں چونک پڑتی تھیں۔

”کیوں بھئی لگ گئے کھیل میں۔“ یا اگر مفلوج دادی اماں کی آواز بند ہوئی (کبھی کبھی وہ سو بھی جاتی تھیں) تو فوراً چلاتی تھیں ”ارے بفاتن دوڑ دیکھ اماں کا کیا حال ہے“ بفاتن فوراً آکر انہیں جھنجوڑتی تھی ”اے بیوی اچھی خاصی ہیں سو گئی تھیں۔“

آخر اللہ نے ہم دونوں کو ایک دن اس مکتب سے نجات دی۔ ایک رات دادی اماں جو خاموش ہوئیں تو پھر نہ بولیں۔ ان کا کفن دفن ہونے لگا۔ ہم کو چھٹی مل گئی۔ کیا مسرت کا دن تھا دوسرے دن اور بھی خوشی کا دن آیا ہمارے ابا آگئے اور معلوم ہوا کہ ہم سب کو بھی لے چلیں گے۔

خوشی خوشی ہم سب جھانسی گئے۔ یہاں سول لائن میں ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ ابا نے اُسے خوب سجایا اور بنایا تھا خاندان کی کئی ایک سن رسیدہ عورتوں کو لے آئے تھے۔ کوئی کسر نہ چھوڑی تھی حتیٰ کہ ایک اماں بھی ہمارے واسطے لائے تھے یہ ہماری منجھلی اماں صاحبہ مرحومہ تھیں۔ نوکروں۔ ماماؤں اور چھوکریوں کی ایک فوج سی تھی۔ ہائے کیسی چہل پہل اور رونق رہتی تھی ہمارے واسطے دو دو ماسٹر مقرر ہوئے، ایک انگریزی کے دوسرے اردو کے۔ اردو پڑھانے والے ماسٹر ہم سے بہت ڈرتے تھے اور انگریزی والے سے ہم ڈرتے تھے اتنا کہ ان کے آگے زبان ہی نہ ہلتی تھی۔ گھنٹہ بھر ماسٹر صاحب خود ہی ایک ایک لفظ باآواز بلند یاد کیا کرتے تھے اور ہم سنتے رہتے تھے کوئی دو برس اور گزر گئے۔ اس دو برس میں ہماری علمیت نے کافی ترقی کی۔ بکروں کی سواری کرنا۔ گائے کے بچھڑے کی دُم میں کنستر باندھ کر بھگانا۔ جھاڑیوں میں گھونسلے تلاش کرنا۔ درختوں پر چڑھنا۔ برابر کے بنگلوں کے یوریین اور اینگلو انڈین لونڈوں کے مقابلے میں ڈھیلے چلانا۔ بہت کچھ سیکھ گئے۔ تین تین اور چار چار میل دور تک تمام پہاڑیوں کے مکمل جغرافیہ سے واقف ہو گئے۔ ہر کھڈ، ہر درخت، ہر جھاڑی اور ہر چٹان سے واقفیت حاصل کی۔

اس علمیت کے میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے بورڈنگ میں داخل کر دیئے گئے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ اس طویل کسمپرسی کے دور میں کوئی بھی

میرا اتالیق اور چاہنے والا نہ تھا۔ نہیں یہ غلط ہے اور بالکل غلط۔ ماں کے مرتے ہی اللہ نے مجھے انتہا سے زیادہ چاہنے والی ماں دی۔ وہی میری اتالیق تھی اس کی تعلیم کا اثر آج اب بھی میری رگ رگ میں موجود ہے۔ یہ مجھ سے ایک برس بڑی اشفاق جہاں۔ اچھو باجی ہیں۔ (خدا ان کی عمر دراز کرے) خو کیا تھیں اور ان کی ہستی ہی کیا تھی۔ میں ان سے قد میں بڑا اور تندرست تھا غصہ آتا تو ڈھکیل دیتا تھا۔ کاٹ کھاتا تھا چٹکیاں لیتا تھا۔ مگر یہ ہنستی رہتی تھیں۔ رات کو ان کی سفید باہوں پر اپنی چٹکیوں کے نیلے نیلے نشان دیکھ کر پھر میں شرمندہ ہوتا تھا اور روتا تھا۔ یہ جب بھی ہنستی رہتیں اور مجھے بچے کی طرح تھپک تھپک کر کہتیں کہ ہمارا رفن بڑا ہو کر باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ طرح طرح کی عظیم باتیں کرتی تھیں اور نا معلوم کہاں کہاں کے قصے سناتی تھیں۔ انہوں نے بوڑھی یا بزرگ بن کر کبھی بھی کوئی نصیحت نہ کی بلکہ کبھی کسی بات کے واسطے منع تک نہیں کیا اس چھوٹی سی لڑکی نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ میرے دل پر اپنے مذہب اپنی قوم اور اپنے خاندان کی عظمت کا بڑا گہرا احساس پیدا کر دیا۔ ان کی تعلیم سے اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا رذیلوں سے بھری پڑی ہے اور خال خال اِدھر اُدھر شرفا ان کے بیچ میں آباد ہیں۔ اور ان شریفوں بھر میں سب سے بڑے خاندانی شریف ہم لوگ ہیں۔ اچھو باجی نے نہ معلوم کیوں اور کس علمیت کی بنا پر مجھے یہ بتایا تھا کہ ہم لوگ اصل عرب ہیں ہمارے باپ دادا بڑے بڑے بادشاہ ہوئے ہیں اب بادشاہت ہمارے خاندان میں سے نکل گئی مفلسی کے دن آ گئے لیکن اسے کیا ہوتا ہے ہم ہیں تو بہت بڑے خاندانی شریف زادے، بس یہی ایک تعلیم تھی جو میرے دماغ میں نقش ہوئی۔ باقی ہر طرح سے دماغ کورا ہی رہا۔ اللہ رکھے ۱۳ برس کی عمر تک نہ بتا سکتے تھے انگریزی اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ نہ معلوم کیوں کر اور کس وجہ سے یاد ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ میں پہچان بھی لیتا تھا۔ انگریزی کے بہت سے لفظ بھی یاد تھے۔ اردو کے گو لفظ نہ پہچانتے تھے لیکن دو کتابیں حفظ تھیں۔ یہ استعداد تھی تیرہ برس کی عمر تھی قد سولہ برس کے لڑکے کے برابر ہو گا کہ جب ہم اٹاوہ پہنچے۔ بورڈنگ کی کسمپرسی عقل کی کمی۔ کتابوں کا ڈر دل پر غالب۔ خاندانی غرور سے سرشار، حالت قابلِ رحم نہیں قابلِ عبرت ہو گئی۔ پہلے سال کے ختم پر گھر آئے تو نہ صندوق نہ کپڑے

نہ کرتا ہیں۔ نہ بستر۔ بال بڑھے ہوئے میلے چیکٹ کپڑے پہنے منہ پر ہوائیاں چلے آرہے ہیں۔ ہفتوں گھر بھرنے مجھ پر لعنت ملامت کی اور ہفتوں راتوں کو مجھے گلے لگا لگا کر اچھو باجی چپکے چپکے رویا کیں اور ہر صبح کو ہمارا منہ جھاویں سے رگڑ رگڑ کر دھلاتی رہیں۔ "ہائے ہائے میرا بھائی کالا ہو گیا" سرخ سفید رنگ تھا اس پر جھاویے کی رگڑ پڑتی تھی منہ چقندر ہو جاتا تھا۔ اچھو باجی کو جب بھی تسکین نہ ہوتی تھی۔ آخر پھر ہم نے وہی حرکتیں شروع کر دیں ڈھکیل دیا۔ چٹکیاں نوچنے لگے۔

دو برس اٹاوہ پڑھے۔ پھر گھر بھر علی گڈھ چلا گیا۔ ادھ بنی جعفر منزل میں کچھ دن رہے۔ پھر ایک دفعہ سب چل دیئے۔ اب کی ہم علی گڈھ میں ظہور وارڈ میں داخل کئے گئے نہ معلوم کیوں کر چوتھے کلاس میں ہو گئے تھے۔ اب ہم کو دراصل پڑھنے کی طرف توجہ ہوئی۔ تین برس خوب پڑھا اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہر طرح یہاں دل لگا۔ تیسرے برس بورڈنگ کے ہیڈ مانیٹر کر دیئے گئے۔ اس زمانہ میں ہیڈ مانیٹر ایک خود مختار بادشاہ تھے سیاہ سفید کے مالک تھے آج حکم ہے کہ قورمے کے سالن میں گودے گودے کی تمام ہڈیاں ہمارے واسطے رہیں گی۔ کل حکم ہے کہ ہر لڑکا فیلڈ میں ننگے پیر آئے آج کبڈی ہو گی غرضیکہ ہماری خوشی۔ قانونی حکم تھا۔ حکم سے کسی کو انکار کی تاب نہ تھی۔ سال بھر تک فرعونیت کی یہاں تک کہ وقت ختم ہو گیا۔ اپنا اور اپنے وزراء کے جانشین چن کر سلطنت ان کے سپرد کی اور خود ظہور وارڈ کو حسرت سے دیکھتے ہوئے میکڈونلڈ ہاؤس چل دیئے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچوں میں ہم دیو تھے وہاں اب بڑے بڑوں میں بھنگا ہو گئے۔ دل پر صدمۂ عظیم گزرا پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ پارٹیاں بنا بنا کر پالٹیکس اور خانہ جنگیوں میں مصروف ہوئے۔ مگر کچھ کسی طرح سے نہ چلی نتیجہ صرف اتنا ہی نکلا کہ ساتویں کلاس میں فیل ہو گئے اس عرصہ میں والد صاحب پنشن لے چکے تھے۔ بھوپال میں اسسٹنٹ انجینئری پر ملازم ہو گئے۔ اچھو باجی کی شادی ہو گئی۔ میں، مجھ سے چھوٹی بہن منجھلی اماں صاحبہ کے ساتھ بھوپال بلا لئے گئے یہاں ہم نے آٹھویں اور نویں دونوں کلاسیں ماسٹروں کو ڈرا دھمکا کے پاس کر لیں۔ بھوپال میں ایک خاص شخص سے واسطہ پڑا جس نے پھر میرے دماغ اور کیریکٹر پر گہرا اثر ڈالا ہمارے بھتیجے (ہم سب چار بہن اور دو بھائی تھے سب کا ذکر نہیں کیا یہ سب ہم سے بہت بڑے ہیں سب سے بڑے بھائی صاحب مجھ سے ۱۸ برس بڑے ہیں۔

آج تک ہم دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دُور رہتے ہیں) فاروق کے پڑھانے کے واسطے ایک ماسٹر رکھے گئے ان کا نام حضور احمد تھا۔ جب دیکھا کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں یا منمنا منمنا کے باتیں کر رہے ہیں ہنسی ہر وقت چہرے پر رہتی تھی حتیٰ کہ کتابیں پڑھنے میں بھی مسکراتے ہی رہتے تھے۔ زندگی کی ہر چیز میں ہر بات میں ان کو تمسخر کے پہلو نظر آتے تھے عُمر ان کی تیس برس کے قریب ہو گی۔ شروع شروع آتے جاتے ان کو دیکھتا تو سخت نفرت پیدا ہوتی۔ چھ ماہ تک ان سے بات ہی نہ کی مجبوراً کچھ بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ پھر کچھ اور اتفاقیہ یہ معلوم ہوا کہ مقناطیس تھا جس نے مجھے کھینچ لیا۔ انگریزی ان کو خاک نہ آتی تھی عربی بھی شاید کام نکالنے بھر کی یعنی کتابیں پڑھنے بھر کی آتی تھی۔ فارسی اور اردو کا کیا کہنا ایک زندہ کتب خانہ تھے تواریخ سے شوق بہت بڑا ہوا تھا لٹریچر کا ذوق سلیم تھا۔ شاعر تھے حضور تخلص تھا لیکن کہتے بہت کم تھے اور جو کچھ کہتے تھے ضائع کر دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ چالیس برس کی عمر پر پہنچ کر کہوں گا۔ فی الحال زمانہ طالبعلمی ہے۔ حضور احمد نے میرے آگے ایک نئی دنیا روشن کر دی۔ اب مجھے علم کا میدان ایک اصلی چیز نظر آنے لگا۔ خود اُس وقت تک قطعی جاہل تھا۔ عمر کافی گذر چکی تھی کیا کر سکتا تھا۔ حافظہ خدا نے یا تو مطلق دیا ہی نہ تھا یا عہدِ طفلی کی اس نکم باین نکم کی رشتے داروں کی چھین جھپٹ کی نظر ہو چکا تھا۔ اردو میں رسالہ مخزن بڑی آب تاب سے اس زمانہ میں شائع ہوتا تھا ہر چند پڑھنا چاہا مگر گھنٹہ بھر میں اُلجھ اُلجھ کر ایک صفحہ پڑھا تو دماغ پراگندہ ہو گیا لطف کیا خاک آتا۔ آخر حضور احمد کا ہی دماغ چاٹنا جاری رکھا۔ دن دن رات رات بھر اُن کا دماغ چاٹتا تھا نہ میری سیری ہوتی تھی نہ وہ تھکتے تھے موتیا تالاب کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھے ہیں اور ایک رخی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بول رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں "دیکھئے رفیق میاں اب اسی خیال کو حافظ کس سادگی سے ادا کرتے ہیں۔" فارسی کا شعر پڑھا۔ لفظ لفظ کے معنی بتائے۔ پھر شعر کے معنی بتائے ہر ہر باریکی پر رائے زنی کی۔ حضور احمد اکثر اور بہت بگڑ بگڑ کر کہا کرتے تھے کہ "رفیق میاں فارسی تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے اس کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو لکھنؤ والوں کے گھروں میں روزمرہ کی بول چال میں استعمال نہ ہوتا ہو۔ یہ یوں ہے یہ یوں ہے۔ یہ لیجئے کوئی شعر لے لیجئے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم بہار آخر شد

کیا ہے کچھ نہیں۔ حیف ؟ حیف ہے مجھ پر کہ طوطا چشمی کروں اور نتیجہ پر زدوکوب ہو میری تعلیم وغیرہ۔

ایک سال نہ گذرا تھا کہ میں فارسی سمجھنے اور بولنے لگا (پڑھنا تو کجا آج تک اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی)

اور ان کی ہر وقت کی دلی مسرت کی تہ کو پہنچ گیا۔ ان کے خیال میں ظاہر شے بیکار ہے۔ اصل باطن ہی ہے۔ وہ ہی ہونا چاہیئے انسان کسی بھی چیز کا ماہر اور کامل ہو گیا تو وہ ہی سب سے بڑی سلطنت ہے۔

جس طرح میلی پھتوئی پہنے دوکان پر بیٹھا بنیا کھڑے ہو کر دس تسلیمیں کیوں نہ کرے لیکن ڈپٹی کلکٹر صاحب کو حقارت سے ہی دیکھتا ہے۔ ویسے ہی علم کا مہاجن دنیا بھر کو دیکھتا ہے۔

افسوس کہ حضور احمد کی صحبت جلد ختم ہو گئی۔ دو برس کے بعد بھوپال سے بھی ہمارا آب و دانہ اٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر مارے کھدیڑے پھر کر ہم اٹاوہ پہنچے۔ اب والد صاحب نے اٹاوہ کی بودوباش اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں حضور احمد دل کے ارمان دل ہی میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے

مجھ پر حضور احمد کا اثر پڑ چکا تھا۔ چاہتے تھے کہ ٹھوس علمیت حاصل کریں مگر کیا پڑھیں کیونکر پڑھیں اسکول کے ہر مضمون سے انتہائی نفرت نہ اردو جانیں، فارسی، انگریزی وہ بھی نہ آتی تھی۔ جغرافیہ اور تواریخ گدھوں کی ایجاد۔ گدھوں کے واسطے تھی۔ غرضیکہ ریاضی سے کچھ دلچسپی معلوم ہوئی ارتھمیٹک لے کر بیٹھے اب جو دلی شوق کے ساتھ اُسے دیکھا تو گل کھلنے لگے مزہ ہی آگیا ایک ہفتہ میں چکرورتی کی ارتھمیٹک ختم کر دی۔ دوڑے دوڑے ماسٹروں کے پاس گئے۔ یہاں تک کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی التجا کی کہ اس سے اوپر کی اور کتاب دیں لیکن سب نے انکار کر دیا معلوم ہوا کہ یہ علم بس یہیں تک ہے ختم ہو گیا بڑا رنج ہوا۔ اب جامیٹری اٹھائی۔ ناول کی طرح سب جلدیں چاٹ گئے۔ وہ بھی ختم ہو گئی۔ الجبرا پکڑا۔ ایک ماہ میں نہ صرف کتاب ہی ختم کر دی بلکہ انگریزی بھی آگئی۔ ہم یہاں کُل دس ماہ رہے۔ ہمارے دوست عظیم بیگ چغتائی کلاس فیلو تھے اور ہم چار بڑے

گہرے دوست تھے۔ میں، عظیم بیگ، ادھم عثمان ایک لڑکے کا نام بھول گیا کھر پا جیرم اس کا لقب تھا۔ میں کہلاتا تھا موگلی (کپلنگ کی "جنگل بک" کا بھیڑیوں میں پلا ہوا انسان ہے) ہم بھی کچھ کم وحشی نہ تھے انتہا یہ کہ ایک دن گھر سے بھاگ گئے۔ ایک پلندہ (افسوس مانگی ہوئی) ریاضی کی کتابیں صرف دو جوڑے کپڑے بمبئی پہنچے۔ انجینیری کا شوق سوار تھا۔ پندرہ بیس دن بڑی خاک چھانی کسی کارخانے میں کسی طرح نہ گھس سکے۔ آخر ایک نیپئر فاؤنڈری اینڈ انجینیرنگ ورکس میں قلیوں میں لے لئے گئے۔ اُس زمانے میں مزدوروں سے خالص بارہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ صبح چھ سے بارہ تک اور ایک سے شام کے سات بجے تک لوہے ڈھوتے تھے۔

کالے بھجنگے بغیر ہاتھ دھوئے (کیونکہ وقت خراب ہوتا تھا) بھٹیارے کے یہاں کھانا کھایا جلدی سے سو گئے۔ رات کے دو بجے سے صبح پانچ بجے تک پڑھتے تھے وی آئی ٹی انسٹیٹیوٹ کے داخلہ کے مقابلہ امتحان کی تیاری تھی۔ معمولی لیاقت انگریزی اور حساب کی چاہیئے تھی۔ تھوڑی کیمسٹری اور فزکس کی بھی ضرورت تھی۔ یہ دونوں چیزیں نئی تھیں انگریزی کا بھی بہت ڈر تھا نہ معلوم کیا کیا پڑھ ڈالا۔ اِدھر کارخانے میں بھی ترقی ہو گئی تھی مزدور سے کھرادی ہو گئے تھے۔ سوا روپیہ روز ملنے لگا تھا خرچ کچھ تھا ہی نہیں۔ چور بازار کی پچیس تیس کتابیں پڑھ گئے چھ ماہ یہی حال رہا امتحان دیا پاس ہو گئے انسٹی ٹیوٹ میں لے لئے گئے۔ اب گھر بھی اطلاع کی۔ سب سے پہلے اچھو باجی کا تار۔ پھر منی آرڈر ملا پھر خط۔ چلو پھر انسانوں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ آدمیوں کی طرح رہنے لگے۔ کالج کے طالب علم ہو گئے مگر افسوس اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ دماغ کی تیزی نے اور مزاج کے تلون نے برباد کر دیا تھا۔ انجینیرنگ کے شعبوں کی کتابیں ہر طرف نظر آتی تھیں شوق سے دل معمور تھا۔ اللہ نے دماغ تیز دیا تھا (گو حافظہ غائب) پہلے اپنی کلاس کی سب کتابیں پڑھ گئے۔ پھر دوسرے تیسرے اور چوتھے سال تک کی کتابیں پڑھ ڈالیں (ان میں بی ایس سی کی ریاضی تک شامل ہے) اب کیا پڑھیں، کچھ پڑھنا ہی نہیں۔ انجنیئری کی پڑھائی ہمیشہ کے واسطے ختم کر دی باقی تین برس ایک لفظ نہ پڑھا ایک کتاب نہ خریدی غرور ایسا کہ پروفیسروں کو ٹوک دیں۔ مقابلے کے دعوے کریں۔ کالج اور کلاس سے غیر حاضر، بیکار کی گپوں میں وقت ضائع کرتے رہے۔ لٹریچر میں کوئی بتانے والا ہی نہ تھا کہ کیا پڑھو۔ چور بازار کی پرانی کتابیں لا لا کر پڑھتے رہتے تھے۔ نہ معلوم

کیا کیا خاک دھول ناولیں پڑھ ڈالیں۔ لکھنؤ چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے کہ نخاس میں ایک کتاب نظر آئی خرید لی اس کا نام تھا مارٹرڈم آف مین (افسوس کھو گئی اور پھر نہ ملی) چارلس گرے وائس کے بھتیجے ایڈورڈ چارلس کی لکھی ہوئی تھی ۵۰۰ صفحہ کی کتاب تھی کم از کم بارہ دفعہ پڑھی۔ اصل میں دنیا کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن ارتقاء دماغ سے لے کر انسانی دماغ کے آخری عروج تک تاریخ ہو گئی ہے۔ اس کتاب نے پھر مجھ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ لوگ سمجھتے ہیں دہریا بنا دیا۔ غیر جو کچھ بھی ہو بس ایک کتاب ان تین برسوں میں پڑھی ہے ۱۹۲۰ء میں آخری سال کا امتحان دیا۔ ہفتہ کو امتحان ختم ہوا اور پیر کے دن پچھتر روپے مہینہ پر ایک انجنیئرنگ کے دفتر میں کام کرنے لگے دو مہینہ کام کیا۔ گھر بھاگ گئے۔ ۱۹۱۷ء میں شادی ہو چکی تھی۔ گھر پر بیکار کیسے بیٹھتے اب ملازمت تلاش کی تو ملی نہیں جھانسی کے ریلوے ورکشاپ میں گھس گئے چھ مہینہ کام کیا اور پھر چھوڑ بیٹھے۔ سارده نہر کی تعمیر شروع ہو رہی تھی اسی میں بن بسا کے جنگل میں جگہ مل گئی نو ماہ کام کیا اور چھوڑ چھاڑ گھر آ بیٹھے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں پھر بلائے گئے شاہ گڈھ میں تقرری ہوئی کچھ عرصہ افسرانِ اعلیٰ مسٹر شیلی اور روبنج سے لڑتے بھڑتے رہے استعفےٰ کی بندوق بغل میں دبائے ان کو دھمکایا کریں کہ ان کا تبادلہ ہو گیا اور بقیہ زندگی کی تباہی کے مکمل سامان ہو گئے یعنی چھوٹے سے قد کے گول مٹول رائے صاحب، لالہ رام نرائن صاحب .... اسسٹنٹ انجنیئر اور انند پر کاش وائل صاحب اگزیکٹیو انجنیئر کی جگہ پر آ گئے کچھ عرصہ جھپٹیں ہوا کیں۔ کام کے قدرداں دونوں ہی تھے کچھ دنوں کے بعد معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا۔ ایک اماں بن گئے دوسرے ابا۔ لاڈلے بیٹے کو اشارہ کر دیا۔ تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر۔ چھ برس دن عید اور رات شب برات کے گذرے۔ شکار اور تاش۔ تاش اور شکار، بے عنوانیاں، بے قاعدگیاں کیں۔ مگر اپنے کام سے دلی محبت تھی جب آن پڑا جان لڑا دی کام پر حاوی رہے۔ جتنا کرنا تھا اس سے دوگنا اور تگنا کیا مگر وہی نہ وقت کی پابندی نہ قانون کی پابندی۔ نہ کسی کی ماتحتی نہ افسری۔ طبیعت کا جنگلی پن سوایا ہوا غرور چوگنا عیش پسندی ایک نئی چیز پیدا ہوئی۔ اس عرصہ میں گنتی کی ایک کتاب بھی نہ پڑھی لہو لعب میں یہ زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ بدلیاں ہونے لگیں۔ وائل اور رام نرائن کو چھوڑ کر دوسرے کی ماتحتی یہ خیال

بھی ہم کو گوارا نہ تھا۔ استعفیٰ دے دیا منظور نہ ہوا۔ روپوش ہو کر بھاگے۔ اب ایک سرگردانی کی طویل داستان ہے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ جب سے آج تک چودہ ملازمتیں کر چکا ہوں۔ ہر جگہ کام سے سب خوش رہے۔ سگولی کو چار دفعہ چھوڑا۔ کریرا کو تین دفعہ اور پھر چلے گئے۔ منیجر اور جنرل منیجر نے ہمارے گھر بھیج بھیج کر ہم کو بلوایا سب ہی طرح ہماری خوشامد اور دل جوئی کی مگر آہ وائل صاحب اور لارام نرائن صاحب کی ناز برداریوں کے شکار ہو چکے ہیں نہ ویسے قدرداں ہوں گے نہ ہم کہیں لگ کر رہیں گے۔ آج کل گورنمنٹ سنٹرل ورکشاپ کان پور میں پلاننگ سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ کئی بار استعفیٰ پے در پے دے چکا ہوں منظور نہیں ہوتا اگر ویسے ہی چھوڑ کر بیٹھ جاؤں تو آرڈیننس ایکٹ میں گرفتار ہو کر باندھا اور گھسیٹا جاؤں قہر درویش بر جانِ درویش یہاں پڑا ہوں اور قسمت کو روتا ہوں۔

یہ ہے میری مختصر زندگی کی طولانی داستان۔

جھوٹا ہوں سچا ہوں دیوانہ یا سنکی۔ جو کچھ بھی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں۔

'کچھ میری زبانی'

• ـــــ فضل قدیر

مندرجہ بالا شخصی خاکہ خود سید رفیق حسین کے قلم سے رقم ہوا ہے۔ یہ انہوں نے اپنے ایک ادھورے افسانے "فسانۂ اکبر" کی ابتداء میں دیا ہے۔ یہ افسانہ انہوں نے زندگی کے آخری ایام میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل وہ دہلی گئے تھے اور مرحوم شاہد احمد صاحب مدیرِ ساقی سے طویل ملاقاتیں رہی تھیں جس کے دوران سید صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ قدیم مغلیہ دور کی تاریخ پر مبنی کوئی افسانہ لکھنا چاہتے ہیں۔ شاہد صاحب نے "دربارِ اکبری" کی ایک جلد انہیں پیش کی تھی۔ یہ کتاب ان کے مطالعہ میں رہی (یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کم کرتے تھے مگر جب کرتے تھے تو انتہائی ڈوب کر)

انہوں نے اپنی زندگی کی جو جھلک فسانۂ اکبر کی ابتداء میں پیش کی ہے وہ بے کم و کاست درست ہے اس میں کوئی بات بھی غلط نہیں۔ البتہ اس میں بعض پہلو وضاحت کے متقاضی ہیں جنہیں میں ان کے

تخیل و تصور کی جڑوں تک پہنچنے کیلئے اپنی فہم مشاہدے اور ان سے بعض بالمشافہ گفتگوؤں کی روشنی میں آگے پیش کروں گا۔

زندگی کی آخری نوکری جو انہوں نے کی وہ کانپور میں دوسری جنگِ عظیم کے اختتامی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ کانپور میں اس وقت ہوائی جہازوں کی مرمت کے لئے ایک ورکشاپ قائم کی گئی تھی اس میں ان کا عہدہ پلاننگ سپرنٹنڈنٹ کا تھا۔ یہ زمانہ میرے لڑکپن کا تھا علی گڑھ سے گرمیوں کی تعطیل میں جب گھر آیا تو کچھ دن کے لئے وہ مجھے بڑے اصرار سے وہاں لے گئے تھے۔ میں نے انہیں ان کے دفتر میں کام کرتے انتہائی انہماک سے میکینیکل گتھیوں میں مستغرق بھی دیکھا۔ یہیں میری موجودگی میں انہیں شدید بخار اور سینے میں سوزش کا حملہ ہوا......وہ واللہ اعلم کس تخلیقی کرب میں مبتلا تھے کہ ہر وقت ایک ہیجان اور شدید اعصابی کھچاؤ کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق وہ ایسا سیال ذہن اور ایسی براق ذکاوت رکھتے تھے کہ اپنے احساسات خود ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتے تھے اس پر ستم یہ تھا کہ قدرت نے اس بیچین روح کو ایک ایسے گھر میں دے پٹخا تھا جہاں اس کی تخیلی تگ و تاز تک پہنچنے والا کوئی نہ تھا۔ لکھنؤ کا زوال زدہ درمیانہ درجہ اور اس کی مخصوص ذہنیت کی ہر جگہ کارفرمائی تھی۔ اہلِ خانہ کو شکایت تھی کہ یہ استغنےٰ خان ہیں ڈھنگ سبھاؤ سے کہیں جم کر کام کرنا ہی نہیں جانتے۔ بڑی بوڑھی ساس نما بزرگ خواتین کا کہنا تھا "سدا کے سڑی ہیں" میرے خیال میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ آج کا کوئی تجریدی آرٹسٹ اگر کسی طرح پچاس برس اُدھر لکھنؤ کے محلہ شاہ گنج میں کسی گرتی ڈھیتی حویلی میں جنم لیتا تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جاتا وہی کچھ سید رفیق حسین کے ساتھ ہوتا رہا۔ غالباً اپنے لطیف تخیلات پر دن رات آرے چلتے دیکھ کر ہی انہیں خود کو دھیرے دھیرے مٹانے کا راستہ اختیار کرنا پڑا......میں نے جب آخری مرتبہ انہیں کانپور میں تپِ لرزاں میں دیکھا تو اس وقت وہ بے دودھ کی چائے یعنی "کاوے" کی بے انداز پیالیاں پیتے اور بے توے کی چلم جسے عرفِ عام میں سُلفہ کہتے ہیں دم پہ دم کشید کرتے تھے۔ خشک کھانسی انہیں نڈھال کردیتی مگر وہ اس شغل سے باز نہ آتے۔ گھر والوں کا تاثر یہ تھا کہ وہ کوئی جناتی خلقت کے انسان ہیں جن پر ان چیزوں کا چنداں اثر نہیں ہوتا چنانچہ سب بے فکر تھے چونکہ ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے وہ سخت چڑتے تھے اس لئے مجھے خیال ہوا کہ ان کے اعصاب میں خشکی دوڑ گئی ہے اور بلغم سوکھ

گیا ہے۔ ہماری والدہ جو ان کی چھوٹی بہن تھیں۔ عام خشک کھانسی میں اکثر ہم لوگوں کو ایک چٹنی بنا دیا کرتی تھیں اُس میں سرخ رنگ کی رُبِّ سوس کی ٹکیاں۔ مغز بادام مغز تخم کدو اور منقے پیس کر لعوق سپستاں میں آمیز کئے جاتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن پاس محلہ گُتیا کے بازار سے جو میں گزرا تو وہاں مجھے عطار کی دوکان نظر پڑی میں نے چٹنی کے یہ اجزاء کسی قدر مقدار میں خرید لئے اور ان کی بیگم کو تھما دئے کہ اس طرح چٹنی سی بنا کر اُنہیں استعمال کرائیں۔ آپ لیٹے ہوئے سُن رہے تھے فرمایا لاؤ یہ پڑیاں مجھے تھماؤ۔ پڑیاں لے کر انہوں نے بادام مغز کدو، ربِ سوس وغیرہ وغیرہ ٹافیوں کی طرح گٹکنا شروع کر دیئے دوسرے روز صبح جب وہ منھ دھونے بیٹھے تو انہیں بڑی سخت کھانسی کا دورہ پڑا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا میں تو سمجھا یہ چلے...... مگر کچھ دیر بعد بہت سا پیلا بلغم خارج ہوا اور اُنہیں سکون ہو گیا.... تو چیخ کر بولے۔ ارے یہ لڑکا بڑا دانا ہے اس نے جو چیزیں مجھے دیں یہ مادہ انہیں نے اکھاڑا ہے...... غرض بڑے استعجاب سے تعریف کرتے رہے مگر افسوس اس کے بعد انہوں نے ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا۔ میں گھر لوٹ آیا پھر علی گڑھ چلا گیا جہاں کچھ عرصہ بعد یہ خبر بد سنی کے انہوں نے طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔

'فسانۂ اکبر' میں جہاں انہوں نے اپنا شخص خاکہ مختتم کیا ہے وہاں سے وہ ایک افسانوی موڑ مڑے ہیں۔ انہوں نے ایک سرکاری کام سے اپنا آگرہ جانا اور وہاں فرصت کے چند یوم میں تاریخی عمارتوں کی سیر کرتے ہوئے ایک باؤلی میں اپنا اترنا دکھایا ہے۔ جہاں یہ گرمی کی تمازت اور خستگی سے منھ ہاتھ دھونے کے لئے اترے تھے۔ یہ باؤلی گویا ٹائم ٹنل تھی جس میں اُتر کر وہ صدیوں پیچھے شہنشاہ اکبر کے دور میں جا پہنچے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ سائنس فکشن جو اردو میں نئی چیز تھی کو متعارف کرانے میں اولیت کے درجہ کے وہ مستحق ہیں ان کی زبان اور پلاٹ کو کھولنے اور دھیرے دھیرے اُسے پھیلانے کا انداز اپنی جگہ ایک عظیم فن ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں پیش کرتا ہوں۔ موقع وہ ہے جب اس اجنبی کو درباریوں نے پکڑ کر شہنشاہ ہند اکبر کے حضور پیش کیا ہے۔

"بڑی منت سے فارسی میں کہا "خدائے بالا و برتر خوب می داند کہ سحر نمی کنم بلکہ خود گرفتار طلسم شدہ ام در بارگاہِ خالق خود التجا می کنم کہ مرا ازایں خواب پریشاں بیدار بہ کند۔"

اس وقت سب درباری اپنی اپنی جگہ ناراض معلوم ہونے لگے اور کئی غصہ میں کچھ کچھ کہنے

لگے۔ اب بادشاہ نے آہستہ سے ہاتھ اٹھایا۔ فوراً سب دم بخود خاموش ہو گئے بادشاہ نے کہا" مابدولت اپنی زبان سے آپ اس کی جان کو امان بخشنے کا اعلان کرتے ہیں اور اب ہم خود اس سے سوال کریں گے اے اجنبی شخص کس کا بھیجا ہوا مُخبر ہے اور کس مملکت یا ولایت سے آیا ہے"۔

میں :۔ "گم شدہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب اور اس کا دیدار۔! شہنشاہ اکبر اور مجھ سے بات کرے۔ میرا ایسا مقدر کہاں۔! افسوس کہ یہ خواب ہے اصلیت اس کی کچھ بھی نہیں"۔

اتنی بات مُنہ سے نکلنا تھی کہ ایک راجپوت سردار جھنجلایا ہوا میری طرف لپکا چھُری کی نوک میرے شانے میں بھونک کر بولا۔ اپنی چٹکیوں سے یقین نہ آیا تو یہ لے اب تو یقین آیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔

میرے شانے سے خون کی بوندیں ٹپاٹپ فرش پر گرنے لگیں دوسرے ہاتھ سے میں نے شانہ دبا کر پکڑ لیا۔

اکبر نے کہا "نہیں نہیں اذیت دینے سے کیا فائدہ"۔

راجپوت :۔ "مہابلی سوال کریں اور یہ چوہا جواب سے یوں گریز کرے"۔

اکبر :۔ (مسکراتے ہوئے) صبر سے کام لو۔ میری طرف دیکھ کر۔۔۔ اچھا یوں ہی سہی مابدولت اور یہ سب امراء خواب ہی سہی، پتلیاں سہی (مسکرا دیئے) کیا تم خواب کی پتلیوں کو یہ نہ بتاؤ گے کہ سونے سے پہلے تم کہاں تھے۔

میں :۔ بے شک خواب میں بھی اکبر اعظم کی حکم عدولی نہ کروں گا۔ بتاؤں گا اور ضرور بتاؤں گا لیکن داستان لمبی اور پیچیدہ ہے کہ چار سو برس کا وقفہ کہنے والے اور سُننے والوں کے درمیان حائل ہے۔ مجھ کو چند لمحوں کی مہلت دی جائے کہ دماغ پراگندہ کو درست کروں اور وہ طرزِ بیان سوچوں کہ جس سے میرا کہا نازشِ مسلمانانِ جہاں شہنشاہِ ہند اکبر اعظم کی سمجھ میں آجائے اگر اس وقت کرم شاہانہ فرما کر ایک پیالی چائے کی پلوا دیں تو ہوش و حواس درست ہو جائیں۔ صبح چائے پی کر چلا تھا اب شام ہونے والی ہے۔

اکبر :۔ چائے کیا چیز ہے؟

میں :۔ فارسی کی تعلیم نہیں ہے ایسے ہی زبردستی سیکھ گیا ہوں۔ خدا حضور احمد کو غریق۔۔۔

خیر خیر چائے کا فارسی نام نہیں آتا سیاہی مائل سرخ ہوتی ہے۔

یہ مکالمہ خاصہ طویل ہے ان کے سامنے شراب لائی جاتی ہے۔ افیون کا شربت لایا جاتا ہے ...... چائے چونکہ اس دور میں دستیاب نہیں اس لئے سگرٹ کی فرمائش ہوتی ہے اور جب یہ بھی اس اقلیم میں دستیاب نہیں تو اس سلسلہ کا آخری مکالمہ یوں ہے۔

میں :- "اب کیا ہوگا تمباکو اور چائے دونوں ابھی تک دنیا میں دریافت نہیں ہوئی ہیں خیر بہتر ہے۔ سنیئے حالانکہ وقت کے دریا میں تمام عالم ابد کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے لیکن مجھ بدنصیب کی گنگا الٹی بہہ پڑی اور چار سو برسوں بہاؤ سے اوپر کھینچ لائی یعنی ۱۹۴۲ء کا انسان ہوں غوطہ کھا کر جو نکلتا ہوں تو اپنے کو چار سو برس پہلے کی اس دنیا میں واپس پاتا ہوں"۔

اوپر کی خط کشیدہ عبارت کو پڑھیئے جو شخص زماں کا اتنا عالمانہ تصور رکھتا ہو اُسے جاہل کیسے کہا جا سکتا ہے؟ مگر اس کا کیا کیجئے کہ ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "دراصل غور و فکر کو ان کے مزاج سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو ساری عمر جو دل میں آیا کہہ اور کر ڈالتے کے عادی رہے کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ اسکول و کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی مگر مطالعہ وسیع تھا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی درست نہیں۔ افسانہ نویسی و مضمون نگاری کے دور سے قبل وہ خالی وقت میں پڑھا ضرور کرتے تھے مگر سستا لٹریچر یعنی گھٹیا انگریزی مار دھاڑ والی (WILD WEST) ناولیں اردو نہ ان کو آتی تھی نہ میں نے اردو کی کوئی قابلِ ذکر کتاب پڑھتے کبھی دیکھا۔"

(مضمون :- "سید صاحب" مطبوعہ نیا دور جون ۶۸ء)

اب بس رد و کد میں الجھنا چاہتا نہیں لیکن جو افسانے آپ کے سامنے ہیں۔ انشائیے زر و جواہر جو اس میں بکھرے پڑے ہیں ان پر ایک نظر ڈال کر میں تو کیا پروفیسر سید مسعود الحسن رضوی ادیب مرحوم نے کہا تھا۔ "یہ کتاب تو ایک صحیفۂ آسمانی معلوم ہوتی ہے"۔ اور یہ بات انہوں نے میری بہن الطاف فاطمہ کے سامنے کہی تھی اور مسعود صاحب کے صاحبزادے سید اختر مسعود رضوی بھی جو اب پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر ہیں اُس وقت موجود تھے ..... وہ اس بات کی تصدیق کریں گے ... مسعود صاحب مرحوم لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی و اردو شعبہ کے صدر تھے خود کوثر و تسنیم سے دُھلی زبان لکھتے تھے۔ وہ سید رفیق حسین کی سلاست سے پُر نکھری ستھری زبان کے عاشق

تھے ...... بار بار ان کے افسانے پڑھتے اور جھوم جھوم کر لطف لیتے تھے۔ اب کیسے مان لیا جائے کہ انہیں اردو نہیں آتی تھی ..... !

اس سے بھی زیادہ ستم ایک دوسرے مقام پر ان سے برتا گیا ہے۔ زیرِ حوالہ مضمون میں صاحبِ مضمون لکھتے ہیں۔

"سید صاحب کو قواعد و اصول سے ازلی بیر تھا۔ انہوں نے تو ساری زندگی صرف ایک اصول برتا اور وہ تھا بے اصولاپن اس لئے شکار میں بھی وہ اسی پر کاربند تھے۔ شکار تو محض نام تھا جنگل میں گھس کر وہ قتلِ عام کیا کرتے تھے۔ بندوق چلاتے وقت وہ نر دیکھتے تھے نہ مادہ بیٹے بچے سب کو تہہ تیغ کرنا ان کے لئے روا تھا۔"

(مضمون 'سید صاحب' نیا دور جون ۶۸ء)

زیرِ نظر اس افسانوی مجموعہ کے متعلق قارئین میری اس رائے سے بہرحال اتفاق کریں گے کہ سید رفیق حسین کے افسانے حیوان ناطق (انسان) اور حیوان بے نطق (چوپاؤں) کے وہ آنسو ہیں جو مشیت کے دامن پر بکھر کر ہنوز جذب نہیں ہوئے ہیں۔ ایسے رقیق القلب شخص سے جو چوں چوں کرتی چڑیوں پر رویا ہو جس نے بے زبان گھوڑی کی داستانِ محبت میں جان ڈالی ہو۔ جس نے کٹہرے میں بند شیر کی سوچ میں اتر کر زبانِ بے زبانی سے یہ کہلوا دیا ہو کہ یا ربّ! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟ یقیناً اس کی زمین فطرت پر تشدد اور ایسے بھیانک تشدد کا پودا اُگ ہی نہیں سکتا۔ بہرحال میں نے ان اصحاب سے اس کی چھان بین کی جو اس زمانے میں سید صاحب کے قریب تھے جب وہ بن بسا میں مقیم تھے انہوں نے اس کی قطعی تردید کی ہے۔

اب جہاں تک ان کے شکاری ہونے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سید صاحب ابتدائے جوانی میں سار دا نہر کی تعمیر کے ایک شعبے میں ملازم ہو گئے اسی نہر کی تعمیر میں ان کے بڑے بھائی خان بہادر سید حامد حسین بھی بحیثیت انجینئر شریک تھے بن بسا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انتہائی گھنا جنگل اپنے گرد و پیش رکھتا تھا۔ اور اس میں ہر قسم کے درندوں اور جانوروں کی بہتات تھی۔ سید صاحب کا معمولی انداز میں چیتل۔ پاڑے ہرن وغیرہ مار لینا ایک عام سی بات تھی۔ انہیں شیر کا شکار دیکھنے اور شکاری پارٹیوں میں شامل ہوتے

کے مواقع بھی ملے لیکن وہ یقیناً شکار میں اتنی گہری دلچسپی نہیں رکھتے تھے جتنی جنگل میں جانوروں کو دیکھنے اور ان کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے میں رکھتے تھے۔ کانپور میں زندگی کے آخری ایام میں یہ بات انہوں نے زور دے کر خود مجھ سے کہی کہ میں کوئی بڑا شکاری نہیں تھا اور نہ ایسا سمجھتا ہی ہوں۔ میں نے اکثر راتیں پیڑ پر صرف اس لئے گذاریں کہ دیکھوں شیر ادھ کھائے شکار کو دوسرے دن کس طرح کھاتا ہے اس لئے زد پر آجانے کے باوجود میں نے اکثر اس پر فائر بھی نہیں کیا۔ اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اسی زمانے میں ایک دن چہل قدمی کرتے ہوئے جب میں نے ان سے کہا کہ آپ کے افسانوں کی بڑی دھوم ہو رہی ہے۔ آپ آج کل کیوں کچھ نہیں لکھ رہے ہے تو لمبی سانس کھینچ کر بولے۔ بیٹا بات کچھ بھی نہیں ہے I AM ADEEP THINKER تم یقین کرو میں کوئی عجوبۂ روزگار ذہن رکھنے کا دعویٰ نہیں کرتا ہاں..... گہرائی اور بہت گہرائی میں سوچنے نے مجھ پر بہت سے پردے کھول دیئے ہیں۔ پھر کہنے لگے اب تم بھلا کیا یقین کروگے کہ میں نے حساب۔ ٹرگنامیٹری اور الجبرا کی کتابیں لیٹ کر ناولوں کی طرح پڑھی ہیں۔ اس منزل پر میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو ان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو گیا کہنے لگا یقین کرو بغیر کاپی پر سوال لکھے انہیں پڑھ کر اور ہوا میں ہندسوں کی ضرب و تفریق کر کے میں میٹرک کے زمانے میں بی۔ اے تک کی ریاضی کی کتابیں پڑھتا اور مسائل حل کر لیتا تھا..........

اسے یقیناً ذہن کی انتہائی مرکوزیت اور استغراق اور انہماک کا معراج ہی کہا جائے گا یہی بات انہوں نے اپنے خاکہ میں بھی لکھی ہے۔

اب میں بہت چلتے چلاتے انداز میں ان کی زندگی سے متعلق کچھ باتیں عرض کرتا ہوں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا میں خود کو نمایاں کرنے کیلئے اس مضمون کو طول دے رہا ہوں؟؟ خدا علیم ہے ایسا نہیں ہے مجھے اس کی نہ حاجت ہے اور نہ تمنا۔ یہ باتیں میں ایک ادبی فرض سمجھ کر لکھ رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سید رفیق حسین نے جس انداز سے جانوروں کی زندگی کے بہلو بہ پہلو انسانی زندگی کا مطالعہ کیا اس کی کوئی مثال اردو تو اردو عالمی ادب میں نہیں ملتی اور یہ یہی بات چونکا دینے والی ہے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں میں ان کے افسانے ترجمہ

ہو چکے ہیں۔ اردو میں ان کے افسانے معدوم کیوں ہو گئے۔ اس کے متعلق کچھ کہنے میں ہچکچا رہا ہوں۔ انسان سماجی جانور ہے۔ ڈرتا ہوں کہ مجھ پر لے دے نہ شروع ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عرصہ تک مرحوم کے بعض لواحقین نے آٹھ افسانوں کو اس مجموعے سے لاپرواہی برتی اور نامعلوم کیوں اس کی اشاعت سے متعلق ہر تجویز کو مسترد کیا۔

بہر حال ایسا گرانڈیل ادیب ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت بہت عرصہ مٹی کے نیچے دبی نہیں رہ سکتی ایک نہ ایک دن یہ ادب نئی نسل کو چونکائے گا اور یقیناً جدید ذہن کا ناقد ان جڑوں کو ضرور ٹٹولے گا اور یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اتنے عظیم ادب کے سوتے کہاں پوشیدہ تھے، یہ انتہائی صوفیانہ لہریں کن چشموں سے پھوٹیں اس وقت ناقد اس جینئس کی شخصی زندگی میں اترنا چاہیں گے۔ میں ان کو صحیح ڈگر پر رکھنے ہی کے لئے یہ چند باتیں لکھ رہا ہوں۔

سید رفیق حسین کی زندگی یقیناً بڑی غیر مرتب زندگی تھی یہ بھی درست کہ اعلیٰ تعلیم انہوں نے نہیں حاصل کی یہ بھی درست کے وہ جلد جلد نوکریاں چھوڑتے پکڑتے رہے۔ مگر اس افتاد اور ان کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے دبے قدموں ان کے ماضی میں ذرا اتریئے۔ وہ ماں کی شفقت بھری آغوش سے بہت کم عمری میں محروم ہو گئے تھے۔ ماں کی موت کے وقت ان کی عمر بمشکل ۸ برس تھی میری والدہ جو ان سے چھوٹی تھیں دو یا ڈھائی برس کی تھیں۔ ان دونوں بہن بھائیوں میں محبت کی بھوک بڑی شدید رہی۔ رفیق حسین نے کلوا میں منتن کے کردار میں بڑی حد تک اپنے احساسات کو سمو دیا ہے۔ منتن کا باپ خشک اور سخت گیر ہے ماں محبت کی دیوانی ماں ہے وہ باپ کے بے جا غصہ کے درمیان اکثر حائل ہو جاتی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں۔ "افسوس اے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے رنج منی منی خوشیاں معصوم گلے شکوے ہوتے ہیں۔ مائیں اس دنیا میں انہیں کسمپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں" تو کچھ لوگوں نے یہ قیاس دوڑایا ہے کہ یہ گویا وہ اپنی ماں کیلئے لکھ گئے ہیں جو بے حد ناز اٹھانے والی ماں تھی۔ ہوں گی ضرور ہوں گی مگر غریب رفیق حسین کو ماں سے ناز اٹھوانے کی مہلت ہی کہاں ملی جس بچہ کی عمر بمشکل آٹھ برس ہو اس کے دل میں ماں کی محبت کی بھوک تو ضرور ہو گی ماں پر تنقید نہیں ہو سکتی (یہاں ان سے سہو

ہوا ہے میری والدہ فرماتی تھیں ۵ یا ۶ برس سے زائد عمر اس وقت ان کی نہ تھی۔"

سید صاحب کے والد خان بہادر سید جعفر حسین صاحب مرحوم جو میرے حقیقی نانا تھے لڑکپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ اپنے سب سے بڑے بھائی احمد حسین صاحب کے ساتھ پرتاب گڑھ میں رہتے تھے۔ کھیل کود کے بڑے شوقین تھے بھاوج نے کسی دن کوئی نا ملائم بات کہہ دی بہ غیرت کے مارے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنے بچپن میں خود ان کے منہ سے سنا کہ جیب میں چنے اور گڑ رکھ کر انہوں نے رڑکی کا سفر پا پیادہ کیا۔ وہاں برسوں ایک وقت دو موٹی روٹیاں اور بسا اوقات ہفتوں چنے کھا کر اوورسیری کی تعلیم لی۔ محنت شاقہ ان کی گھٹی میں پڑی تھی ساری عمر شدید محنت کی جسم کھردرا اور طبیعت انتہائی حقیقت پسند ہو گئی تھی وہ اپنی محنت سے آگے بڑھے اور بڑھتے بڑھتے چیف انجینیری تک پہنچ گئے......
مگر وضع قطع سے دیو بند کے کوئی مولوی نظر آتے تھے طمطراق ٹھاٹھ باٹھ اور صاحبیت سے انہیں سخت نفرت تھی۔ پھر خاندان اللہ والوں کا جدِ اعلیٰ سید امیر کلال جیسا بزرگ ان کے ہاں ریشم پہننا انگوٹھی پہننا سب کچھ مکروہ اور خلافِ شریعت تصور کیا جاتا تھا خان بہادر جعفر حسین صاحب کو سر سید سے بڑی عقیدت تھی اور انہوں نے ساری زندگی ان کے صفِ اوّل کے ایک لفٹننٹ کی طرح گزاری۔ سر سید کی مقصدیت اور حقیقت پسندی ان پر بڑی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ وہ مزدوروں کی طرح محنت کرتے اور انہیں بھی یہ احساس تھا کہ وقت کم ہے جلد سے جلد کچھ کر لینا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاق محنت اور موٹا جھوٹا کھانے نے انہیں بلا کا عصبی المزاج بنا دیا۔ جب جلال آتا تو بری طرح چیختے اکثر اپنا منھ پیٹتے۔ وہ کنبہ پرور شخص تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا خاندان ان ہی کی طرح شدید محنت سے آگے بڑھے۔ لکھنؤ کے محلہ نخاس سے رکاب گنج کو جانے والی سڑک پر ایک طرف ایک چھوٹا سا محلہ ہے جو احاطہ اور سیران کہلاتا ہے۔ یہاں ان کے کچھ رشتہ دار رہتے تھے۔ جن کے لڑکے زوال زدہ لکھنوی سماج کے زیرِ اثر مستقل قیلولہ کیا کرتے تھے جعفر حسین صاحب نے ان سب کو پکڑا اور نقشہ نویسی اور سیری کا کام ڈنڈے مار مار کر سکھایا۔ ان میں علی اختر، عرف اغن صاحب بھی تھے یہ بلا کے نقال اور مسخرے تھے۔ جس زمانے میں وسط ہند کے ایک مقام پر جہاں سید صاحب

تعنیات تھے یہ پورا ٹولہ ان سے پراجیکٹ پر کام سیکھ رہا تھا۔ ایک دن بڑے سید کسی کام سے اِدھر اُدھر گئے تو اغن صاحب نے ایک قوال کی نقل شروع کر دی۔ اچانک بڑے صاحب کا جب ادھر سے گذر ہوا تو انہوں نے شاگردوں کی اس ٹولی کو محو سماع دیکھ لیا۔ اغن صاحب پر ایک بجلی کی طرح جھپٹے اور انہیں کھینچ کر دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ اور کہا سارا دن تالیاں ٹھونکتے رہو اور کہتے جاؤ "تا تھک تا تھیا تھیا"۔ خود مونڈھا ڈال کر بیٹھ گئے اور یہ غریب گھنٹوں "تا تھک تا تھیا تھیا" کرتے رہے۔ غرض اس طرح مار دھاڑ کر سب کو اورسیر بنا دیا اور اس طرح یہ لوگ رزقِ حلال کھانے کے قابل ہو گئے چونکہ سارے اورسیر کا کام کرتے تھے اس لئے یہ احاطہ اورسیران مشہور ہو گیا۔ سید جعفر حسین صاحب جب کسی کام میں لگتے تو انہیں دنیا اور مافیہا کا ہوش نہ رہتا۔ چنانچہ جب ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے رفیق حسین اور چھوٹی بیٹی کو مختلف رشتہ داروں کے ہاں رکھا ان کی سیدھی سادی طبیعت نے اس کے اثرات اور ان اچانک تغیرات پر کبھی غور ہی نہ کیا وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں مختلف مقامات پر تبدیل ہوتے رہے اور یوں لڑکوں کی پڑھائی میں تواتر اور ماحول میں توازن ختم ہو گیا جس کے نتیجے میں میٹرک میں بڑے لڑکے سید حامد حسین ۲ بار فیل ہوئے تو سید جعفر حسین صاحب نے انہیں گھر سے نکال دیا اور رشتہ داروں کو خطوط لکھ دیئے کہ خبردار اسے اس کی پشت پناہی نہ کرنا۔ یہ بھی ٹھوکریں کھا کر خود ہی سنبھلے اور یہی سید رفیق حسین کے ساتھ ہوا۔ اب ظاہر ہے رفیق حسین انتہائی نازک طبع انسان تھے اس درشتگی کے وہ کسی طرح بھی متحمل نہ ہو سکے اور ان کی طبیعت میں بغاوت اور حزن بیک وقت پرورش پاتے رہے۔ لیکن قدیم روایات کے تحت یہ انتہائی تابعدار اور سعادت مند لوگ تھے۔ ذرا غور کیجیے۔ نانا صاحب بنارس تشریف لے گئے یہاں ان کے ایک بھتیجے سید صادق حسین ابن سید احمد حسین رہتے تھے یہ کئی بھائی تھے صادق حسین، افضل حسین، مظہر حسین، اظہر حسین۔ یہاں ایک لڑکی کو دیکھا تو آپ نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے انہیں، بتایا گیا کہ یہ ان کے مرحوم بھتیجے مظہر حسین کی لڑکی ہے۔ پوچھا اس کی شادی کیوں نہیں کرتے عرض کیا گیا بڑی دیر سے تلاش ہے۔ فرمایا اچھا۔ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ باہر نکلے سید رفیق حسین کو تار دیا۔ فوراً پہنچو۔ یہ بوکھلائے ہوئے باپ کی

طلب پر پہنچے میٹرک کا امتحان اسی سال پاس کیا تھا۔ حکم ہوا صادق حسین قاضی کو بلواؤ سائرہ کا نکاح کرو۔ لیجیئے۔ نکاح ہو گیا...... نہ مہمان اکٹھے ہوئے نہ شادیانے بجے نہ جہیز نہ بری......

اب یہ گھرانہ انتہائی مولویانہ انداز کا گھرانہ تھا۔ دبلی پتلی سائرہ نے گھر کے آنگن سے باہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تعلیم بس کلام پاک اور چند مذہبی کتابوں تک محدود تھی۔ یہ ایک انتہائی مسکین خاتون تھیں۔ سید صاحب نے شیریں اور فرہاد میں اقبال دلہن کا جو کردار پیش کیا ہے میرا قیاس ہے وہ لاشعوری طور پر اپنی پہلی بیوی سائرہ کا کردار پیش کر گئے ہیں سائرہ شوہر کو خدائے مجازی تصور کرتی تھیں۔ رفیق حسین اس سے جز بز ہو جاتے وہ کہتے عورت کو گھر پر حکمرانی کرنی چاہیئے...... (یہ باتیں سید تصدق حسین نے جو سائرہ بیگم کے برادر عم زاد ہیں نے مجھے بتائیں ہنوز بقید حیات ہیں) اُنہیں اس مسکین عورت پر محبت سے کہیں زیادہ رحم آتا۔ سائرہ بیگم سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا سلطان رفیق اور دوسری قمر بیگم، تیسرے بچہ کی ولادت میں وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یہ دونوں بچے اس وقت بہت صغر سن تھے۔ ان بچوں کی ماں کے سائے سے محرومی نے سید کے موم کے دل کو بری طرح پگھلا دیا۔ اور وہ اپنی بیٹی قمر کے معاملہ میں بڑے جذباتی باپ تھے۔ سلطان رفیق نے باپ کی طرح بڑے اتار چڑھاؤ میں زندگی گذاری۔

سید صاحب کی پہلی بیگم کا جب انتقال ہوا تو یہ جوان ہی تھے دوسری شادی ان کی خالہ نے مشرف بیگم بنت عابد حسین خان صاحب سے کر دی جن سے صرف ایک لڑکا سید عثمان رفیق ہے۔...... دوسری جنگِ عظیم میں سلطان بنارس میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے نہ معلوم کیا سودا سر میں سمایا کہ فوج میں جا بھرتی ہوئے اور وہ بھی ایک عام سپاہی کی حیثیت سے سید کے دل پر یہ ایک اور ٹھوکر لگی، اپنی بلند و بالا طبیعت کے ساتھ انہوں کے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ بری طرح ہل گئے۔ اس لڑکے سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور وہ تھا بھی ان کا مثنیٰ صورت اور شکل ہی میں نہیں عادات میں بھی، صاف دل کھلنڈرا روتوں کو ہنسانے والا رقیق القلب اتنا کہ جب چھوٹی بہن قمر بیگم کا انتقال ایک

بچی کی ولادت میں ہوا تو یہ بچی کو اٹھا لائے اور اپنی بیوی سے کہا عطیہ تمہارا بچہ ڈبہ کا دودھ پیئے گا اور یہ بچی تمہارا دودھ پیئے گی۔ سید باغوں اور کنجوں کی تنہائی میں بیٹھ کر بیٹے کو میدانِ جنگ میں خط لکھا کرتے تھے۔ ہفتہ کا ایک دن سلطان کو خط لکھنے کے لئے وقف تھا۔ جب ان پر کینسر کا حملہ ہوا تو جنگِ عظیم مختتم ہو رہی تھی حلق بند ہو گیا تھا انہیں سلطان کا انتظار تھا۔ وہ چھٹی آیا شاید قدرت انہیں اسی لئے جلا رہی تھی۔ بچھڑے ہوئے ملے۔ پھر ہمیشہ کے لئے طویل جدائی ہوئی اور اب پھر دونوں باہم ہو گئے ہیں۔ ابھی بمشکل دو سال ہوئے ہیں کیپٹن سید سلطان رفیق کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا اور عجیب المیہ یہ ہوا کہ تیسرے دن اس کی بیوی عطیہ دماغ کی رگ پھٹ جانے سے میاں کے پیچھے دوڑ کر پہنچی۔

جس دن سلطان صاحب کا سوئم تھا اس دن ان کی بیوی کو جنرل شاہد حامد نے گلے لگا کر تسلی دینی چاہی (جنرل صاحب سلطان کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں) تو یہ بے ہوش ہو گئیں۔ اور ایسی بے ہوش ہوئی کہ تیسرے دن ہی میاں کو جالیا۔ ٹھہر و تو جاتے کہاں ہو ......

رہے نام اللہ کا ......

سلطان بھائی کے ذکر کے بعد اب میں سید رفیق حسین کے دوسرے صاحبزادے عثمان رفیق کی طرف آتا ہوں یہ ان کی دوسری بیگم مشرف بیگم مرحومہ کے تنہا لڑکے ہیں میرے ہم عمر ہیں کراچی میں کاٹن انسٹی ٹیوٹ میں معقول عہدہ پر فائز ہیں۔ اس مجموعہ کے قارئین کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سید رفیق حسین کا یہ مختصر خاندان عجب رحمتوں اور خوبیوں کا حامل رہا ہے۔ عثمان باپ کی طرح بلا کے منکسر، خاموش، اور انکساری کے مرض کا شکار ہیں۔ محبت کا یہ عالم ہے کہ بھائی سلطان اور بہن قمر کے ساری زندگی عاشق رہے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ جان قربان کر دیں اس لئے بھائی بہنوں کو سوتیلا سمجھنا میرے نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہیں یہ بھتیجے بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں پر بھی دم چھڑکتے ہیں اور ہمہ وقت ان کی بہبود اور بہتری کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ انکسار کا یہ عالم ہے کہ چند سال ہوئے فن پارچہ بافی پر ایک رسالہ اپنا لکھا ہوا دکھایا تھا اس خوبصورتی اور عمدگی سے اس میں مضامین کی درد بست کی تھی کہ میں عش عش کرتا رہ گیا تھا۔ مگر وہی انکسار جو باپ پر طاری رہا کچھ ان پر زیادہ ہی طاری رہے۔ اگر کبھی اس خول سے نکل کر اس کتابچہ کو شائع کیا تو یہ تکنیکی ادب میں اہم اضافہ

ہوگا۔ عثمان کی بیگم یعنی شہزادی بیگم ملنساری، نیکی، شرافت اور خوشدلی کا پیکر ہیں اور بجا طور پر اس خاندان کا تاج ہیں۔

سید رفیق حسین صاحب کی پہلی بیگم میری یاد سے بہت پہلے فوت ہو گئی تھیں (میں سلطان صاحب سے تقریباً ۱۲ برس چھوٹا ہوں) اس لئے ہم سب نے مشرف بیگم ہی کو جنہیں ہم سب ممانی جان کہتے تھے دیکھا ہے۔ مشرف بیگم بمشکل ۲ سال ہوئے فوت ہوئی ہیں۔ یہ رشتہ میں سید صاحب کی بھانجی ہوتی تھیں دونوں کی عمروں میں کافی تفاوت تھا۔ یہ عجب باغ و بہار طبیعت کی مالک تھیں۔ باتیں کرتیں تو منھ سے پھول جھڑتے، کام کرتیں تو مردوں کو شرماتیں پھر اس پُر مزاح میں بلا کی بزلہ سنجی تھی۔ کاش کوئی ان کی گفتگوئیں ٹیپ کر لیتا کیسی ستھری نکھری متوالی اردو تھی۔ محاورے اور کہاوتیں گفتگو میں عجب رنگ بھرتے تھے۔ انہوں نے سید رفیق حسین کو بڑا سہارا دیا طویل بے روزگاریوں کے درمیان کبھی اُف نہ کی۔ سید صاحب کے مضامین میں جہاں عورتوں کے مکالمے یا گفتگوئیں آ گئی ہیں وہ عین ان کی بیوی کے محاورے میں ہیں۔ اور سید صاحب کی ٹکسالی انشاء پردازی میں اس ذہین خاتون کا بڑا حصہ ہے۔ افسوس وہ بھی نہیں رہیں۔ وہ تو لکھنؤ کی ثقافت کی بولتی کتاب تھیں۔ اور اچھو باجی جن کا ذکر انہوں نے مثل ماں کے کیا ہے ابھی چند ماہ ہوئے فالج میں مبتلا ہو کر یہیں پنڈی میں فوت ہو چکی ہیں۔ یہ مشہور وکیل اور تکنیکی کتابوں کے مصنف آفتاب عمر صاحب کی اہلیہ تھیں۔

اب باقی کی باتیں میں جناب اشفاق احمد (ڈائریکٹر ترقی اردو بورڈ) اور اے حمید اردو کے مشہور افسانہ نگاروں پر چھوڑتا ہوں کیونکہ حقیقی معنوں میں یہ دو ان کے معنوی پسر ہیں۔ اشفاق احمد نے تو ایک موقع پر جذبات سے بے قابو ہو کر ایک پوچھنے والے سے کہا تھا۔ پوچھتے ہو رفیق حسین کون تھے تو سنو۔ جس طرح اُردو شاعری اپنا ایک خدا رکھتی ہے (یعنی میر) اسی طرح اردو افسانے کا بھی ایک خدا تھا۔ رفیق حسین اور اے حمید نے مجھ سے کہا تھا۔ ۲۰ سال گذر گئے ہیں تکئے کے نیچے اس صحیفۂ آسمانی کو رکھتا ہوں سونے سے پہلے اس کی کچھ نہ کچھ تلاوت ضرور کرتا ہوں۔ میں ان کو دعوت دیتا ہوں آؤ اور آگے بڑھ کر اسی سرمائے کو انگریزی اور دوسری زبانوں تک پہنچا دو۔

میزان

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

- یادش بخیر
- حیوان اور انسان

یادش بخیر!

آج سے کوئی تیس سال پرانی بات ہے۔ ایک بار میں نے مولوی عبدالحق سے کہا کہ اردو ادب میں حیوانوں کا ذکر نہیں ملتا۔ جواب دیا کہ "میاں ہمارے ادب میں تو انسانوں کا بھی ذکر کم ہے، حیوانوں کی کیا پوچھتے ہو۔"

لیکن اُسی زمانہ میں ادب پر انسانوں کی ایسی یلغار شروع ہوئی کہ توبہ بھلی۔ ہماری نسل کا نوکِ قلم اس کی بخیہ گری میں سر تا سر مصروف ہو گیا۔ ادب ایک ایسا آئینہ خانہ بنا جس میں انسان اپنی شرافت و کثافت، نیک و بد، ملال و مسرت، غرض کہ ہر چھب کو دیکھتا اور اسی طرح حیران ہوتا جس طرح بندر اپنی شبیہہ کو درپن میں دیکھتا اور پریشان ہوتا ہے۔

ہمارے ادیب کا تجربہ و مشاہدہ شہر سے بڑھ کر دیہات تک پھیلا اور وہاں جا کر محدود ہو گیا اُن سے آگے دشت و بیابان کی دنیا ہے جس میں چھوٹے بڑے پیڑ دل ہی دل میں زندگی کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور چرند و پرند اپنے طور سے وقت گزارتے ہیں۔ کبھی کوئی خدا کا بندہ انسانوں سے ناطہ توڑ کر کائنات کی حقیقت کو بوجھنے کے لئے جنگل کی پُر اسرار خاموشی میں جا پہنچتا ہے۔ ورنہ بیش تر لوگ اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کے لئے بندوق بھالے تان کر وہاں کے معصوم جانوروں کے شکار کے لئے چل پڑتے ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے ملکوں میں نہ اب جنگل باقی ہیں نہ پرندہ نہ حیوان۔ فقط آدمی ایک دوسرے کے شکار کیلئے رہ گئے ہیں۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ جس کے دل میں حیوان سے ہمدردی نہیں ہے وہ انسان کا ہمدرد نہیں بن سکتا۔ اس امر کا احساس غالباً تب بیدار ہوا جب عہدِ نو کے آدمی میں انسانی خوبیاں کم

ہو گیئں اور کُتّے کے علاوہ اسے کسی سے وفا کی امید نہیں رہی۔ اگر کوئی اسے مبالغہ سمجھے تو مغ
شہروں میں کُتّوں کے قبرستانوں، بیمارستانوں اور آرائش گاہوں کو جاکر دیکھے۔ گویا ہر سگِ مغر
سگِ لیلیٰ ہے۔

سیّد رفیق حسین مرحوم کو بھی شکار کا شوق تھا اور اس شوق میں وہ مدتوں جنگل جنگل پھرے
لیکن وہ معمولی شکاری نہ تھے۔ ان میں ایک عمیق فنّی شعور ودیعت ہوا تھا اور اس شعور کی و
سے ان میں چوپایوں کے احساسات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

جو کچھ انہوں نے لکھا وہ اس مجموعہ میں محفوظ ہے اور اردو ادب میں اس کی جگہ دائم ہے۔ ا
افسانوں کے بین السطور کو میں افریقہ جاکر سمجھا۔ وہاں کے جنگلوں میں انواع و اقسام کے وحشی جانو
کو غور سے دیکھنے کے بعد یقین آیا کہ درندگی ان میں انسانوں سے بہت کم ہے۔

افسوس کہ رفیق حسین صاحب کی توجہ قلم کی طرف دیر سے ہوئی اور انہیں زیادہ لکھنے کی ف
نہیں ملی۔ سچ تو یہ ہے پُر نویسی یا پُر خوری کی عادت اچھی نہیں۔ بہر صورت جس مضمون کو انہو
نے شروع کیا۔ اس پر اس کمال سے لکھنے والا اردو میں تو کوئی نظر نہ آیا۔

افسانوں کا یہ مجموعہ ناظرین کی داد کا ہر لحاظ سے مستحق ہے۔

حیوان اور انسان

یہ عجیب سی بات ہے کہ تخلیقی آرٹ میں حیوانی زندگی کا عکس نقاشی میں زیادہ ملتا ہے اور ادب میں کم۔ قدیم اور جدید نقاشوں میں کئی کی توجہ کسی نہ کسی چوپائے یا پرندہ کی طرف گئی اور ان کے خدوخال کی مصوری میں انہوں نے بڑے کمال کا ثبوت دیا۔ یہ عنوان چین اور جاپان کے آرٹ کا ایک خاص باب قرار پایا۔ لیکن ادب میں حیوان کو یہ مقام کبھی حاصل نہ ہوا۔ یہ طرفہ ماجرا ہے کہ کلاسیکل عہد میں جب انسان فطرت سے زیادہ قریب تھا اور بنا برایں جنگلی یا پالتو جانوروں کا ہم سایہ تھا اسے اُن کی ذات سے زیادہ دلچسپی نہ ہوئی بلکہ ان کا ذکر جدید ادب میں کسی حد تک عام ہوا جب کہ حیوانی زندگی یا تو معدوم ہو چلی اور یا چڑیا گھروں میں محدود ہو گئی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کلاسیکل ادب میں حیوانوں کا ذکر مفقود ہے۔ عربی شاعری شُتر غمزوں کی جلوہ گاہ ہے۔ لیکن اونٹ کا کام بس یہ ہے کہ لیلیٰ یا عذرا کو صحرا صحرا محمل پر اٹھائے پھرے۔ مغرب و مشرق کی رزمیہ نظمیں گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز سے گونج رہی ہیں لیکن ان کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سورما کو میدانِ کارزار کی طرف اڑائے لئے جاتے ہیں۔ بلبل کے نغمے اور کوئل کی کوک کی حیثیت شاعری میں محض علامتی ہے۔ غرض کہ اس ادب میں حیوان انسان کا ادنیٰ حاشیہ بردار ہے اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔

اس مضمون کی پہلی مشہور کتاب "پنج تنتر" جو سنسکرت سے کلیلہ و دمنہ کے نام سے عربی میں اور پھر دیگر زبانوں میں منتقل ہوئی دراصل ایک پند نامہ ہے جس کا مقصد حیوانی زندگی کا مطالعہ نہیں بلکہ حیوانوں کی زبانی انسانوں کو اخلاق کا درس دینا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حیوانوں سے اخلاق کے درس کی ضرورت انسان کو آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ بقول سعدی ؎

بہ حقیقت آدمی باش وگرنہ مرغ باشد
کہ ہمیں سخن بہ گوید بزبانِ آدمیت

جدید ادب کا ارتقا سائنس کی ترقی کے ساتھ مغرب میں ہوا۔ اب انسان نے اپنے گردو پیش کو نئے انداز سے دیکھنا شروع کیا۔ اسے دیکھنے اور بیان کرنے کے ہزاروں نئے موضوع میتسر آئے اور ان میں وہ حیوان بھی تھے جنہیں تا ایں دم صرف شکار کا ہدف سمجھا جاتا تھا۔ زندگی کے اس پہلو کے مشاہدہ میں صدہا دیدہ وروں نے اپنی زندگی صرف کر دی۔ اور اب دیس دیس اور بھانت بھانت کے جانوروں اور پرندوں کے متعلق آپ کو بے شمار عالمانہ کتابیں مل جائیں گی۔

تاہم تخلیقی ادب میں ہنوز حیوان کا دخل برائے نام ہے۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں جب ادب پر شعر کی بجائے نثر کا تسلط ہوا، بہ الفاظ دیگر تصوّر کی جگہ مشاہدہ نے لی، تو مغربی ممالک میں جنگلوں اور وحشی جانوروں کا بڑی حد تک صفایا ہو چکا تھا۔ اور ادیب کے لئے ان کے براہِ راست مشاہدہ کے مواقع کم رہ گئے تھے۔ چنانچہ اس مضمون پر ادبی شاہکاروں کا نام انگلیوں پر گنا یا جاسکتا ہے۔ ایک تو کپلنگ کے ناولوں اور افسانوں کا خیال آتا ہے جنہیں اس جادو بیان نے ہندوپاک کے جنگلوں میں گھوم پھر کر لکھا۔ ماتر لنک کی تصانیف جس میں شہد کی مکھی یا چیونٹی کا حیات نامہ اور سرگزشتِ سگ قابلِ ذکر ہیں۔ حال میں افریقہ کی حیوانی زندگی پر بعض عمدہ ناول لکھے گئے ہیں جس میں رہمن گیری کی تصنیف۔ (ROOTS OF HEAVEN) قابلِ توجہ ہے۔

ادب کا موضوع جو بھی ہو اُسے نوکِ قلم تک لانے سے پہلے اس میں دل و نگاہ کو سمونا پڑتا ہے یوں سوچئے کہ عام آدمی کی طرح ادیب کی عمر کا بیشتر حصہ عورتوں اور بچوں میں گزرتا ہے لیکن ان میں سے کتنے عورتوں اور بچوں کے احساسات کی تخلیقی ترجمانی کر سکتے ہیں؟ تو پھر جنگل اور وہاں کے چرند و پرند سے کتنوں کو قربت ہے کہ ان کے رمز کو سمجھیں اور اس کے بیان کا سلیقہ پیدا کریں۔

برصغیر کے ادب کا یہ خانہ قریب قریب خالی ہے۔ دعا دیجئے کپلنگ اور جم کوربٹ کو کے جنگل میں منگل منا گئے۔ ورنہ یہاں کی کسی ملکی زبان میں اس مضمون پر شاید و باید کوئی قابلِ ذکر تخلیقی ادب ملے۔ شکار پہ خال خال اچھی کتابیں ضرور مل جائیں گی۔ مثلاً نواب سرور جنگ

کی تصنیف 'شکار' اور ہندی میں شری رام شرما کی اسی نام کی کتاب۔ لیکن ان کا شمار تخلیقی ادب میں نہیں ہوگا۔

اردو میں اس مضمون کا جائزہ لیجئے تو سرفہرست نظیر اکبر آبادی کی چند نظمیں اور اور نثر میں سید رفیق حسین مرحوم کے ان افسانوں کا نام آئے گا جن کی یاد 'نیا دور' میں تازہ کی جارہی ہے۔

رفیق حسین صاحب کا تعلق لکھنؤ کے ایک معزز اور خوشحال خاندان سے تھا۔ لیکن طبعی آزادمنشی نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کام سے جب فرصت ملتی تو نیپال کی ترائی میں نکل جاتے شکار کم کھیلتے اور حیوانوں کی سیرت کا مطالعہ زیادہ کرتے۔ خود وہ انجنیئر تھے اور قلم سے زیادہ مشین کے ماہر تھے مگر فنی وجدان انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ اور زبان پر انہیں عبور تھا ہی۔ وہ ایک دردمند اور حساس دل بھی رکھتے تھے اور اودھ کی زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا۔ لہٰذا اپنے تجربوں کو قلم بند کرنے کا جب انہیں خیال آیا تو وہ بے تکلفی سے یہ افسانے لکھتے چلے گئے اور جو بھی لکھا خوب لکھا۔ افسوس کہ ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ ناگہانی پیام اجل آیا اور وہ اردو کے دامن میں چند جاوداں پھول بکھیر کر رخصت ہو گئے۔

آج سے پچیس تیس سال قبل رسالۂ ساقی میں یہ افسانے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور بعد ازاں مکتبۂ ساقی نے انہیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ پہلی مرتبہ انہیں پڑھنے کا اتفاق مجھے ۱۹۴۷ء میں ہوا جب میں یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر لوٹا اور دہلی میں دو تین دن کیلئے شاہد احمد صاحب کے دولت کدہ پر ٹھہرا۔ ان کے اصرار پر جب میں کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے لئے بیٹھا تو ہر ہر ورق پر میرا استعجاب بڑھتا گیا اور مجھے یقین آیا کہ اردو افسانہ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

ان کا مجموعہ پہلے 'آئینۂ حیرت' کے نام سے دہلی سے اور پھر 'گوری ہو گوری' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا۔ مجموعہ کے نو افسانوں میں سے دو سے یہ نام مستعار لئے گئے، معلوم نہیں کیوں۔ اس مجموعہ کا نام تو 'حیوان اور انسان' ہونا چاہیئے تھا کیونکہ بادی النظر میں ان میں

جگہ جگہ دو پایہ اور چوپایہ جانوروں کی سیرت کا مقابلہ ملتا ہے اور برتری بہر صورت چوپایہ کی ہی ثابت ہوتی ہے۔

تین عناصر سے مل کر ان افسانوں کی ترتیب ہوئی ہے۔ ایک تو وحشی جانور جو آدمی کی خون آشامی سے ہراساں آبادیوں سے دُور پار جنگلوں میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ دوسرے وہ پالتو جانور جو آدمی کی سیوا ٹہل کر کے چر، چُگ لیتے ہیں اور تیسرے وہ امیر اور غریب انسان جو کوٹھیوں یا جھونپڑیوں میں اوہام کی چادر میں منہ لپیٹے پڑے رہتے ہیں۔ ان تینوں میں جنگل کے آزاد جانوروں کا کردار سب سے اُجلا ہے بجز ایک کانے ہاتھی کے جو ہر یک چشم کی طرح ماحول سے انتقام کے فکر میں رہتا ہے۔

اس پس منظر میں آپ کو چوپایوں اور دُوٹنگے جانوروں کا ایک قافلہ رواں دواں نظر آئے گا جس کے بیان کے لئے مصنف نے بڑا شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ وہ انسان کی ظلم پسندی اور خود غرضی سے اس قدر نالاں ہیں کہ قصہ سناتے سناتے رک کر بیچ بیچ میں اس کی تنبیہہ کرنے لگتے ہیں۔ اور افسانہ کے آخر میں عموماً اسے نصیحت کا تازیانہ لگا دیتے ہیں۔ یہ ایک فنی نقص ہے جس سے کاش وہ احتراز کرتے۔

افسانوں میں کہیں کہیں بڑے ڈرامائی منظر آتے ہیں۔ مثلاً "آئینۂ حیرت" میں بندریا کا قریشی صاحب کے بچے کو لے بھاگنا۔ یا 'بے زبان' میں گونگی کا بوڑھی گھوڑی پر سوار ہو کر ہوا ہو جانا۔ اور یا شیریں و فرہاد میں 'بھوکے بلے کا' بلی کو کھا جانا۔ اس وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ افسانہ کا لازمی انجام یہی ہونا تھا۔ اور ایک مشاق فنکار کی طرح مصنف اسے ایک ذہنی اُلجھن میں گرفتار کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔

ظلم کا مادہ انسان کے خمیر میں مضمر ہے اور یا اس کی تلقین اسے معاشرہ سے ملتی ہے؟ کیا حیوان دشمنی کے ساتھ انسان دوستی ممکن ہے؟ ایک طویل مدت کے بعد آج دوبارہ ان افسانوں کو پڑھتے وقت اس قسم کے سوال میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ افریقہ کے دو سالہ قیام کے دوران میں جنگلوں میں بے بند وحشی جانوروں کو میں نے قریب سے دیکھا ہے اور برملا انہیں دورِ حاضر کے آدمی سے زیادہ مہذب پایا ہے۔

مدتوں کی دشت نوردی کے بعد سید رفیق حسین مرحوم اسی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ جب آخری عمر میں تخلیق کی رگ جاگی تو انہیں ترغیب کارخانوں اور مشینوں سے نہیں ملی بلکہ لکھنے کا اشارہ ان معصوم جانوروں نے کیا جو درختوں کے جھرمٹ میں سینگ جوڑے کان کھڑے کئے ہوئے فضا میں سنسناتی ہوئی بندوق کی گولی کے اندیشہ میں دُبکے رہتے ہیں اور با جو سہمی ہوئی آنکھوں سے ان عزیزوں کی تلاش کرتے ہیں جو حیات و ممات کے دوراہے میں بچھڑ گئے۔ جب رفیق حسین صاحب اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتے تو اس میں بے دردی اور ریاکاری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بین السطور میں ان کے افسانے وہی سوال پوچھتے ہیں جو رومین گیری نے اپنے ناول (ROOTS OF HEAVEN) میں کیا ہے۔ کیا حیوان کا قاتل انسان کا دوست ہو سکتا ہے اور کیا وہ اپنے معبود کو پا سکتا ہے ؟

بے زبان

پانچسو روپے کے انعام کا اعلان سن کر باری باری سب ہی نے کوشش کی۔ ہندوستانی چابک سوار، کابلی پٹھان، توپ خانے کے گورے، اور سپاہی ایک کے بعد ایک کتنے ہی گھوڑی پر سوار ہونے کے واسطے سرکس کے دائرے میں داخل ہوئے اور طرح طرح سے کوششیں کیں۔ لیکن گھوڑی پر سوار ہونا تو درکنار اس کی راس تک چھونا نصیب نہ ہوئی جو بھی آگے بڑھا دونوں کان پیچھے سکیڑ، دانت نکال ہنہنا کے گھوڑی ایسی کاٹنے کو دوڑی کہ بہت سے تو جب ہی گرتے پڑتے سرکس کی دیوار پھاند باہر بھاگے اور اگر ایک آدھ ڈھیٹ بید یا چابک گھماتا کھڑا ابھی رہ گیا تو پھر گھوڑی نے گھوم گھوم کے ایسی دولتیاں چلائیں کہ آخر مجبور ہو کر اس کو بھی پشیمان اور شرمندہ باہر آنا پڑا۔

سرکس کے مینجر نے جو نیچی سی دیوار کے باہر کھڑا تھا چاروں طرف سر گھما گھما کے تماشا دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے پھر اعلان کیا۔ "اتنا جنٹلمین سپاہی اور جوان چاروں طرف ہے۔ کوئی اور آئے، آئے، آئے! جس کا ہمت ہو، جو کوئی اس گھوڑی پر بیٹھے گا اور چار کدم چلائے گا سرکس کمپنی اس کو پانچسو روپیہ انعام دے گا۔" چاروں طرف کوچوں، کرسیوں اور پھر چھت تک پہنچ جانے والی بنچوں پر ہزاروں آدمی بیٹھے تھے۔ سرکس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی آئے۔ ہر طرف سب خاموش شرمندہ

سے بیٹھے تھے، اور ان کے سامنے تماشے کے چھوٹے سے گول چکر کے بیچ میں چمکدار، سیاہ چکنی چپڑی، تندرست، نوجوان، پھرتیلی، چلبلی گھوڑی، گردن کو محرابی خم دیئے، ہنہناتے ہوئے سر کو جھٹکے دے دے کر اور دُم کی چوبری جھپکا جھپکا کر اگلے پیروں سے زمین پر ٹاپیں مار رہی تھی۔ اس کی اس حرکت میں فتح کی مسرت، حسن کا غرور اور شباب کی پھڑک عیاں تھی اور اس وقت جبکہ دُنیا بھر کی نگاہیں اس سیاہ گھوڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ سرکس کا چور دروازہ آہستہ سے کھلا، سن سے بھاگتی ہوئی ایک لڑکی ہوا کی طرح آئی۔ بجلی کی طرح اس کا ہنٹر کوندا گھوڑی اچھلی، پھڑکی اور بھاگی، ہنٹر کوندا اور پھر کوندا۔ گھوڑی جان توڑ۔ سرکس میں چکر لگانے لگی، اب سب کی نگاہیں ..... اس سفید انسانی پھڑی پر جم گئیں۔ بوٹا سا قد، دوہرا جسم، سیاہ بال کھال سے چمٹا، چست سرکس کا لباس، حسن تھا، جادو تھا، قہر تھا کہ سحر تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے پیر، اس کا سینہ، اس کی گردن، اس کا سر، اس کی آنکھیں ہر ایک کشش دل کا مرکز تھا۔ اور کیوں؟ اس لئے کہ وہ ایک مجسمۂ شباب تھی۔ اس کی ہر بات میں شوخی تھی۔ شرارت تھی، ہاتھوں میں پھڑک تھی۔ پیروں میں تھرک تھی، گردن میں لچک تھی آنکھوں میں چمک تھی، دنیا اس کو تکتی تھی، اور وہ بے خبر تھی، ہنٹر گھماتے گھماتے ایک دفعہ وہ لپکی۔ سپاٹے بھرتی گھوڑی پر ہاتھ لگاتے ہی بجلی کی پھرتی سے سوار ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں سے کھلے ہوئے بالوں کو سنوارا، اور پھر بھاگتی ہوئی گھوڑی کی ننگی پیٹھ پر کھڑی ہو گئی۔ گھوڑی نے چکر پر چکر اور تیزی سے لگانا شروع کر دیئے۔ اس وقت اس کے کھلے ہوئے سیاہ بال گلابی ربن کی بندش سے آدھے آزاد پیچھے پھر پھراتے۔ اس کی چست پاجامہ میں ملفوف گول گول ٹانگیں ہلکے ہلکے لچکتی تھیں۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے تھے۔ سرپٹ بھاگتی ہوئی گھوڑی پر وہ ایک رقص سا کر رہی تھی، سب کی نگاہیں اُدھر ہی لگی ہوئی تھیں وہاں چور دروازہ آہستہ سے پھر کھل چکا تھا۔ چکر لگاتے لگاتے ایک دفعہ ادھر گھوم گھوڑی مع سوار اس کے اندر غائب ہو گئی۔ کئی سکنڈ تک تماشبین سکتے کی سی حالت میں خاموش رہے اور پھر تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

سرکس کے لکھنؤ آنے کے چند ہی دن بعد سارے شہر میں گھوڑی اور لڑکی کا شہرہ ہو گیا۔ ان دونوں کے حُسن، خوبصورتی، شرارت اور شہ سواری پر طرح طرح کے اظہارِ خیال ہونے لگے اور بیسیوں روایتیں، افواہیں پھیلتی چلی گئیں۔ کسی کا خیال تھا کہ لڑکی آوارہ ہے کوئی کہتا تھا کہ سرکس والوں کی سخت نگرانی کرنا اور کسی کی ہوا تک نہ لگنے دینا مصلحت سے خالی نہیں بعض کا شبہ تھا کہ لڑکی اور مالک سرکس کے گہرے تعلقات ہیں، اور بعض کو یقین تھا کہ لڑکی مالک کی بیٹی ہے۔ مگر اصل میں یہ سب عقلیہ گدّے ہی تھے۔ کیونکہ سرکس کے کارکنوں اور اداکاروں سے ملاقات یا واقفیت کسی کو بھی حاصل نہ تھی۔ سرکس کے چھوٹے بڑے جانور اُن کے پنجرے اور کام کرتے والوں کو چھولداریاں اور سب کے چاروں طرف اونچی اونچی قناتیں کھڑی کر کے ان کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکس کے مالک یا منیجر کی اپنے لوگوں پر سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی سے نہ ملیں جلیں اور نہ باہر جائیں۔ ایسی حالت میں لکھنؤ کی مخصوص خلقت یعنی شوقین آوارہ منش اور مفلس شرفا، قناتوں کے چاروں طرف اور بھی زیادہ چکر لگانے لگے، کوئی قناتوں کے نیچے سے جھک کر دیکھتا تھا کوئی دروازہ میں سے جھانکتا تھا اور اس طرح سے اگر کسی کو ہاتھی کے پیروں، شیر کے کٹھرے یا ایک آدھ آدمی کی جھلک نصیب ہو جاتی تو پھر وہ طرح طرح کے چشم دید افسانے بیان کرتا پھرتا تھا۔ ان سب باتوں کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہرت نواب محمود علیخان تعلقہ دار ڈلیا باد تک پہنچی اور ایک دن وہ خود ہی سرکس کا تماشہ دیکھنے آئے۔ جہاں ان کے واسطے نشتیں مخصوص کر کے آراستہ کر دی گئی تھیں۔ نواب نے سب کرتب حیرت سے دیکھے اور پسند کئے۔ لیکن سب سے زیادہ اس لڑکی اور گھوڑی کا کھیل پسند کیا۔ تماشا ختم ہونے پر انہوں نے منیجر سرکس کو اپنی نشست پر طلب کیا اور بڑی دیر تک ان کے سرکس کی تعریفیں کیں۔ خاص کر اس لڑکی کی، یہاں تک کہ انہوں نے انعام دینے کے واسطے لڑکی کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا۔ مگر جب منیجر سے یہ معلوم ہوا کہ لڑکی کا تماشہ کرنے کے علاوہ باہر آنا ممکن نہیں ہے تو منیجر کے لئے اپنی رسٹ واچ اور پچاس

روپیہ لڑکی کے واسطے انعام بھجوا دیئے۔ نہ صرف یہی بلکہ دوسرے روز پھر تماشے میں بہت پہلے سے آ گئے منیجر کو بلوایا، دنیا بھر کی باتیں اور ہر پھر کے لڑکی کے متعلق اور گھوڑی کی باتیں کرتے رہے، لیکن اس وقت منیجر اپنا زیادہ وقت نواب صاحب کو نہ دے سکا اُسے تماشے کی جلدی تھی۔ اس لئے چلا گیا۔ تماشا ختم ہوتے پر وہ خود ہی پھر آ گیا، نواب صاحب نے سَو سَو کے پانچ نوٹ سرکس کو انعام میں دیئے۔ بڑی دیر تک باتیں کیں۔ اتنی کہ رات گئے واپس ہوئے، دوسرے دن نواب صاحب منیجر کو اپنے محل پر صبح کھانے پر دعوت دی۔ نواب صاحب کی اس خاص توجہ اور مہربانی کا مطلب منیجر سرکس بھی پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ ستّر سے اوپر محل پینسٹھ برس کی عمر، نواب صاحب کی دولت اور اس کے استعمال سے کون ایسا تھا جو واقف نہ تھا۔ جہاں دیدہ جہاں گشت منیجر نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہی موقعہ ہے جو کچھ بھی کمایا جا سکے کما لیا جائے۔ اس لئے اس نے بڑی تدبر اور دور اندیشی سے کام لیا کھانے کے بعد جب اصل معاملے کی باتیں شروع ہوئیں تو اس نے پہلے تو بڑی ہی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کی۔ اس معاملہ میں کچھ سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کا باپ اور بڑا بھائی دونوں ساتھ ہیں۔ سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر بعد میں جب اس کو بہت کچھ لالچ دیا گیا تو بہت ہچکچاہٹ کے بعد ایک تجویز اس طرح پیش کی:-

"نواب صاحب آپ کے اخلاق اور مہربانی نے مجھ کو مجبور کر دیا۔ لیکن حضور دیکھیں کہ میں کس قدر خطرناک کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو گئی تو دس بارہ برس جیل میں چکی پیسنا پڑے گی۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہو آپ کا کام تو پورا ہی کروں گا۔ کل اتوار کا تماشا ختم کر کے ہم لوگ پرسوں یہاں سے کانپور جانے والے ہیں آپ پیر کی صبح کو اپنا موٹر خود ہی لے کر ہم لوگوں کی قناتوں کے گرد دروازے پر آئیں اور انتظار کریں۔ لڑکی کی طبیعت کچھ خراب رہتی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے واسطے موٹر ہے اور اس دھوکے سے

لاکر اس میں سوار کردوں گا اس کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ اس سے کوئی بات نہ کریں خاموشی سے بٹھائے لئے چلے جائیں۔ محل میں جاکر پھر جو کچھ بھی ہو اُس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ جو کچھ بھی انتظام کرنا ہو کریں۔ رہا میرا اور میرے آدمیوں کا معاملہ تو اب جو بھی قسمت میں بدا ہو۔ لڑکی کے غائب ہوتے ہی اس کے باپ اور بھائی میری بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ نہ معلوم کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے تاہم اتنا تو مجھے ضرور ہی کرنا ہوگا کہ لڑکی کے چلے جانے کے بعد پولیس میں باقاعدہ اطلاع کروں گا۔ ورنہ میں کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اس کے باپ اور بھائی کی زبان بند کرنے کے واسطے بھی ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اس لئے میں حضور سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ دس ہزار سے کم میں یہ کام کرنے پر میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس میں مجھے کیا ملے گا۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ پولیس اور اس کے رشتہ داروں کو دے دلا کر کچھ مل گیا تو مل ہی گیا۔ ورنہ گھاٹے میں چکی پیسنا تو بدی ہے۔ نواب صاحب میں تو پھر آپ سے التجا کروں گا کہ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیں۔ وہ آپ کے بس کی چیز نہیں ہے۔"

سرکس بیس دن لال باغ میں ٹھہرا۔ اتوار کی شام آخری مرتبہ تماشا کرکے پیر کی صبح کو یہاں سے کوچ کا سامان ہونے لگا۔ صبح اندھیرے ہی سائس گھوڑوں کو لے کر پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ باقی جانوروں کے پنجرے چھکڑوں پر لادے جارہے تھے۔ لوگوں کی چھولداریاں گرا گرا کر تہ کی جارہی تھیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں مشغول تھا۔ ایک طرف ایک ہاتھی بیٹھا تھا جس پر بہت سا سامان لدا ہوا تھا اور اس پر چند بندر بندھے ہوئے تھے اب یہ بھی روانہ ہونے کے واسطے تیار ہو گیا تھا باقی ہاتھی ابھی یوں ہی کھڑے جھوم رہے تھے۔ مینیجر کا چھوٹا سا خیمہ بھی لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا نواب صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ ایک آدھ آدمی اِدھر اُدھر سے آکر اس سے کچھ پوچھ گچھ جاتا تھا۔ جس پر وہ ان کو معمولی

ہدایتیں بھی دیتا تھا اور پھر گھڑی کو دیکھ کر انتظار میں لیٹ جاتا تھا۔ نو بجے کے قریب نواب صاحب کے موٹر کا ہارن بجا، منیجر فوراً اٹھ کر قناتوں سے باہر گیا۔ وہاں ایک بہت بڑے موٹر میں جس پر پردے لگے ہوئے تھے، نواب صاحب خود کرتہ پاجامہ پہنے ڈرائیور کی جگہ بیٹھے تھے۔ منیجر نے پاس جاکر سلام کیا۔ نواب صاحب کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ استعجاب سے سرخ تھا مسکرا کر گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کہیئے!"

منیجر:۔ (اطمینان سے) سب انتظام ٹھیک ہے!

نواب صاحب:۔ (جلدی سے) بہتر ہے۔ پھر جائیے جلدی کیجئے۔

منیجر:۔ (نہایت اطمینان سے) میری طرف سے مطمئن رہیں۔ اب آپ بھی تو مجھے اطمینان دلائیں۔ دیکھئے نواب صاحب اس واقعہ کے بعد میرا آپ کے محل پر جانا کسی طرح ٹھیک نہ ہوگا، اور نہ آپ کا یا آپ کے کسی آدمی کا ہی یہاں آنا ٹھیک ہوگا۔ دوسرے کسی اور شخص کا بیچ بھی پسند نہیں کرتا۔

نواب صاحب:۔ جلدی سے گدی کے نیچے سے نوٹوں کا بنڈل گھسیٹ کر اور ان کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے۔ آپ کی رقم آپ کے اطمینان کے واسطے موجود ہے ایک ہاتھ سے لڑکی کو سوار کیجئے۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا معاوضہ لیجئے۔ جائیے جلدی کیجئے، میرا یہاں اس طرح سے زیادہ دیر ٹھہرنا نازیبا ہے۔

منیجر نے ایک دفعہ نوٹوں پر نظر ڈالی۔ مسکراتا ہوا قناتوں کے گھیرے کے اندر گیا، اپنے ڈیرے کے پاس جاکر اس میں جھانکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اندر سے وہی لڑکی۔ وہی تماشا کرنے کا چست لباس پہنے مسکراتی ہوئی نکلی اور منیجر کے پیچھے پیچھے چلدی۔ باہر موٹر کا انجن پہلے ہی سے گھنگھنا رہا تھا۔ نواب صاحب اسٹیرنگ گیر دونوں ہاتھوں سے تھامے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ جوں ہی یہ دونوں پاس آئے نواب صاحب نے للچائی ہوئی ایک نگاہ جلدی سے لڑکی پر ڈالی۔ اس کے گال سرخ تھے۔ ہونٹوں پر لالی تھی، ماتھے پر سے ہوتا ہوا گدی کے چاروں طرف ایک ربن بندھا ہوا تھا، اس کے نیچے سیاہ بال کھلے شانوں پر پڑے تھے۔ وہ نواب صاحب پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی مسکراتی

موٹر کے پاس آئی منیجر نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔ منیجر دروازہ بند کر کے نواب صاحب کے پاس آیا انھوں نے کھسکتے ہوئے موٹر میں سے نوٹوں کا بنڈل منیجر کو دے دیا اور رفتار بڑھادی۔ لمحہ بھر میں موٹر سامنے کے موڑ پر گھوم کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ قناتوں سے باہر فٹ پاتھ پر منیجر صاحب تنہا مسکراتے ہوئے نوٹوں کے گڈے میں سے پرتیں ہٹا ہٹا کر کچھ دیکھتے رہے اور پھر ان کو پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے اندر روانہ ہوئے۔

موٹر سڑک پر غیں غیں۔ ادھر گھوم، ادھر گھوم یہ جا وہ جا نکلا چلا گیا۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ آگیا۔ اور اب وہ سیدھا ڈیلیا باد کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں پوری پختگی اور احتیاط کے ساتھ سب انتظام ہو چکے تھے۔ محل کے زنانے پھاٹک میں جونہی موٹر داخل ہوا بڑا پھاٹک بند کر لیا گیا، اس کے اندر کے صحن میں دو چار کیاریاں، چند درخت اور پودے تھے ایک طرف تین چار ملازم بیٹھے تھے، ایک لمبے دالان کے سامنے اونچا سا چبوترہ تھا، موٹر اس کے سامنے رکا۔ موٹی سی ادھیڑ عمر کی ایک ماما چاندی کا منوں زیور پہنے موٹر کے پاس آئی، دروازہ کھولا، بڑے ٹھسّے سے بولی، "اُتریئے آیئے میرے ساتھ چلی آیئے" لڑکی اب بھی اسی طرح خاموش مسکراتی ہوئی خوش خوش پھرتی سے اُتری اور اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے چل دی۔ ماما نے برآمدے کے کونے پر ایک اور دروازہ کھولا، یہ زینا تھا۔ دونوں اوپر چڑھے۔ ایک اور چھوٹا سا صحن ملا۔ اس کے دوسری طرف ایک بڑا آراستہ کمرہ تھا جس میں زمین پر فرش، قالین، گاؤ تکیئے تھے، دیواروں پر بھدی رنگین تصویریں اور بڑے بڑے آئینے تھے۔ ایک طرف ایک بہت بڑی مسہری مچھر دانی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوسری طرف تختوں کا چھوٹا سا تختہ تھا۔ اس پر بھی چاندنی قالین گاؤ تکیئے وغیرہ لگے۔ جا بجا چاندی کے اگالدان رکھے تھے۔ قالینوں کے کونوں پر اگر بتیاں جل جل کر خوشبودار دھوئیں سے کمرہ کو معطر کر رہی تھیں۔ ایک چوکی پر لوٹا، صراحی، صابن دانی، بیسن دانی سب چاندی کے رکھے تھے، فرش پر گاؤ تکیئے کے برابر قالین پر ایک گنگا جمنی پاندان، دوسری طرف آبنوسی عطردان رکھے ہوئے تھے ایک کونے میں ایک

چھوٹی سی میز پر سبز سرخ رنگ کے پٹاپے دار خوان پوش سے ڈھکی ایک سینی رکھی تھی کمرے کی چھت اور دیواریں طرح طرح کے رنگوں سے بنے ہوئے پھول اور پتیوں سے نظروں کو گھائل کئے دیتی تھیں۔ چھت میں رنگین شیشے کے دو جھاڑ لٹک رہے تھے ماما لڑکی کو لئے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئی۔ تختوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُلٹے پیروں واپس لوٹ گئی۔

لڑکی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی، ہر چیز کو حیرت سے دیکھا۔ تختوں کے پاس گئی۔ پیر لٹکا کر بیٹھی لیکن فوراً ہی جھک کر آبنوسی عطردان کو چھوا اور پھر سیدھی ہو گئی۔ چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں ہے پھر جُھک کر عطردان کے نقوش پر ہاتھ پھیرا۔ نواب صاحب انگنائی کی دوسری سمت کے ایک کمرے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر آکر ہنستے ہوئے اس کمرہ میں داخل ہوتے۔ "ہاں ہاں عطر لگاؤ۔ عطر لگاؤ، یہ تمہارے ہی واسطے ہے۔" ان کے آنے پر لڑکی سیدھی ہو بیٹھی، اور ان کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مسکرائی۔ نواب صاحب نے اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "کس غضب کی تمہاری مسکراہٹ ہے" اور، اور آگے بڑھے، دونوں ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھائے۔ آناً فاناً میں لڑکی کے مسکرانے میں تغیر پیدا ہو۔ ہنسی غائب ہو کر متانت پیدا ہوئی۔ معاً متانت سے پریشانی اور پریشانی سے غصّہ کے آثار اس کے چہرے پر آئے۔ اب وہ ساکت کھڑی اس سفید بوڑھے کو غصّے سے تک رہی تھی۔ نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ "دنیا کا ہر عیش یہاں تمہارے واسطے مہیا کر دوں گا۔ اب تم کو میرا ہی ہو کر رہنا ہو گا۔" پھر اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹی، دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے کو رگڑ ڈالا پھر کندھوں پر پڑے ہوئے گیسو سر سے نوچ نواب صاحب کے سامنے زمین پر دے مارے۔ اور اس کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنی آواز نکالی۔ "آوا وا آ، آو آو وا آ" نواب صاحب مجسمۂ حیرت بنے ساکت کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے چودہ برس کی بدہیئت گونگی لڑکی غصّہ میں بھری بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھی، زور زور

سے ہاتھ رگڑنے سے اس کے چہرے کا غازہ جابجا سے اُڑ چکا تھا۔ جس سے اس کا اصلی سیاہ رنگ چتکبرا ہو گیا تھا۔ چہرے پر زخم کا ایک بدنما داغ دائیں گال سے لے کر کنپٹی تک چلا گیا تھا دوسرا داغ خشخشی بالوں سے آراستہ سر کے بیچوں بیچ نمایاں چمک رہا تھا۔

"٭"

وہاں نہ باپ تھا نہ بھائی۔ مکروہ صورت لاوارث لڑکی کی فکر کون کرتا۔ البتہ گھوڑی کی فکر میں سب ہی پڑ گئے۔ کانپور پہنچ کر اب ہر ایک کی یہ کوشش ہونے لگی کہ لڑکی کی جگہ وہ لے لے، انہوں نے ہر طرح سے اسے رام کرنے کی کوشش کی، لیکن پیار، دلاسہ، مار پھٹکار کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ کیونکہ بچپنے سے انہی لوگوں نے روزانہ اس کے ہزاروں سوئیاں چبھو چبھو کر اُسے دنیا بھر کے انسانوں سے خائف کر دیا تھا۔ یہ لوگ سرکس کے گھیرے میں لا کر طرح طرح کے لباس بدل کر اس کے پاس آتے تھے، اور اس کے سوئیاں چبھوتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ جب تک وہ تھان پر بندھی ہے خیریت ہے اور جہاں اس جگہ سے ہٹی یا آزاد ہوئی سوائے اس لڑکی کے جو بھی پاس آئے گا کسی نہ کسی طرح سوئی ضرور چبھوئے گا۔ اس کو ہر انسان سے دلی نفرت اور عداوت ہو گئی تھی۔ اس کی قدرتی محبت کا رجحان دنیا بھر سے سمٹ کر اس لڑکی پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ نوعمر بے زبان جانور عاشق کی طرح محبت کرنے کو بیقرار، معشوق کی طرح محبت کئے جانے کا منتظر۔ صرف ایک ہی ہستی اس گونگی لڑکی کی منتظر کالی گھوڑی خاموش کھڑی سر کو جھکولے دیتی اور دم سے مکھیاں جھلتی تھی۔ نہ آنکھوں میں اشک نہ لب پر فریاد۔ اگاڑی پچھاڑی بندھی کھڑی ہے۔ کبھی دو ایک منہ گھاس کھالی اور کھڑی ہے۔ کان آگے کئے پیچھے سے سر کو جھٹکے دیئے۔ دُم کی چوبری چل رہی ہے۔ خاموش کھڑی ہے۔ اس میں انتظار ہے، غم ہے اور پھر انتظار ہے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم ہوئے۔ طرح طرح کی مار پڑی۔ ہر ہر طرح سے اس پر سوار ہونے کی کوشش کی گئی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کو لڑکی کا انتظار تھا۔ وہی اس پر سوار ہو سکتی تھی دوسرے کو کیسے پاس آنے دیتی۔ یہاں تک کہ جب پیروں میں سنرے ڈال کر اور منہ پر مہرا باندھ کر اس کو چلنے، دولتی چلانے اور کاٹنے سے بھی بالکل ناکارہ کر دیا گیا تو پھر اس

نے دھڑادھڑا اپنے تیئیں کھڑے قد سے گرا گرا دیا۔ لیکن کسی کو سوار نہ ہونے دیا۔ اسی طرح کی دن دن بھر اس پر سختیاں ہوئیں اور جب بھی لوگوں نے ہار کے جھک مار کے پھر اسے تھان پر لا کر باندھا۔ وہ خاموش کھڑی ہو گئی۔ نہ آنسو نہ آواز نہ سرد آہیں نہ فریاد۔ خاموش! خاموش بے زبان کی ایک ہی زبان خاموشی۔ سر کو دو ایک جھٹکے دیئے دُم ہلائی، خاموش کھڑی ہے۔ گھنٹوں کھڑی ہے۔ دو جھٹکے سر کو دیئے دُم ہلائی اور کھڑی ہے۔ سرکس والوں میں ادھر یہ ہو رہا تھا کہ "اچھا اب سالی کو جلاب اور فاقے دیئے جائیں۔" ادھر اس نے خود دانہ اور گھاس چھوڑ دیا، بانسوں کی مار سے اور اور کھڑے قد سے گر گر پڑنے سے بدن پھوڑا ہو رہا تھا۔ لڑکی کی یاد میں دل بیقرار تھا۔ ہر طرف آنکھیں اسی کو ڈھونڈتی تھیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ اوپری چوٹیں اندرونی غم۔ چند دن اور جو گذرے تو گھوڑی کی صورت ہی اور ہو گئی۔ بھڑکتی، تھرکتی ہوئی موٹی تازہ سیاہ چمکتی بچھڑی کے بجائے سُست، مریل، میلی، سیاہ، گنجی گھُچی گھُڑیا سر جھکائے اونگھتی ہوئی سی کھڑی ہے۔ ٹانگوں پر مکھیاں آنکھوں پر بھُنگے چمٹے ہوئے ہیں۔ کبھی دُم ہلاتی تو ہلاتی ورنہ سر نیچا ہے کھڑی ہے۔ عجیب حالت ہو گئی۔ آخری دن جب سرکس کانپور سے بھی کوچ کرنے لگا تو اس کا نیلام بول دیا۔ پینتیس روپئے اور مالک سرکس کی جیب میں آئے اور گھڑیا بھی یہاں سے رخصت ہو گئی۔ قصہ ختم ہوا، چار دن بعد بھُولے سے بھی کوئی کیوں ان کو یاد کرتا کیسی لڑکی کس کی گھوڑی، گھاس کوڑا، اس کا کیا۔ پڑا ہے تو پڑا ہے۔ نہیں تو آندھی آئی اُڑ گیا، پانی آیا بہہ گیا۔ یہ دونوں بھی دنیا کے سمندر میں تھپیڑے کھاتے بہتے چل دیئے ایک مشرق اُڑ گیا، دوسرا مغرب بہا، پتھر کی سلیں دل کے عارضہ سے آزاد بے حس صدیوں پہاڑوں میں بیٹھی جنتی ہیں۔

جاڑے جاتے ہیں، بہاریں آتی ہیں، جگ پر جگ۔ صدیاں آتی اور جاتی ہیں، قوموں پر قومیں آتی ہیں، نسلوں پر نسلیں جاتی ہیں۔ پر یہ بیٹھی بیٹھی تکتی ہیں اور ہم آندھی کے تنکے اب اُڑے۔ جب گرے پل بھر ہی اڑتے ہیں۔ پھر بھی قسمت کے مارے الفت! محبت، یاس وحسرت، آرزو اور تمنا کا گھروندا۔ یعنی لپ لپ کرتا دل پہلو میں لئے پھرتے ہیں۔ اتفاق نے اکٹھا کر دیا۔ مل گئے۔ حادثات نے جدا کر دیا الگ ہو گئے۔ نہ اس کا

کوئی گھر نہ دوارا۔ سرکس کی زندگی کیا تھی صبح کا خواب تھا۔ چونکے تو کچھ نہ تھا۔ گھوڑی کے لئے یکہ تھا، یکہ والا تھا۔ کانپور کی سڑکیں گلیاں تھیں۔ ادھر لڑکی کے لیے چولھا تھا۔ برتن تھے۔ سل تھی اور بٹہ تھا اور دو بی بیوں کی خدمت تھی۔ مصالحہ پیسنا، برتن مانجھنا، کھانا پکانا، گھر بھر کو کھلانا، بچا کھچا خود کھانا اور پھر اسی کو دہرانا۔ یہی زندگی تھی برس پر برس گذرے۔ گونگی لڑکی، بے زبان، سل پر ہلدی دھنیاں، مرچیں دونوں ہاتھوں میں بٹہ اکڑوں بیٹھی آگے پیچھے ہل، ہل ہل جسم مجسم مصالحہ پیسنے میں لگا ہے اور دل! کمبخت دل! سرکس، سیاہ گھوڑی۔ گھوڑی کی محبت بھری نگاہیں اس کی خمیدہ گردن اس کا خوشنما ماتھا۔ اس کا سر گھما کے دیکھنا، اس کا، اس سے ملنا اس کو گھاس، دانہ دینا۔ اس کی دوڑ، اس کی سواری، اس پر کرتب، ہزاروں آدمیوں کا حیرت سے دیکھنا وہ تالیاں۔ وہ تالیاں! جب دنیا تکتی تھی، دنیا حیرت کرتی تھی۔ یہی وہ زندگی تھی۔ یہی زندگی کا معراج تھا۔ لیکن یہ سب نہ آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سن سکے۔ لوگوں سے نہاں، دنیا سے پنہاں، گیلی گا وہ لکڑیوں کے دھوئیں میں پھوکرتے ہوئے کالی چکنی ہنڈیوں کو سرسراتے جاڑوں کی راتوں میں مانجھتے ہوئے نہ مٹنے والی اور نہ مٹنے والی یاد بے زبان کو ستاتی تھی، جاڑوں میں کٹ کٹ کانپتے ہوئے۔ گرمی میں پسینے سے شرابور ہانپتے ہوئے برسوں بعد گونگی تے وہی گذرے ہوئے دن یاد کئے، پر قسمت نے کسی پہلو کوئی پلٹا نہ کھایا اور زمانہ پلٹتا بھی تو کیا پلٹتا نہ ماں باپ تھے نہ بھائی بہن، نہ رشتے دار تھے، نہ ملنے والے، شوہر نہیں، اولاد نہیں، اس کی زندگی میں کوئی تغیر ہو ہی کیسے سکتا تھا، امید بھی کیا ہوتی، تمنا کیا ہوتی، بے آسرا، بے آرزو دن کٹتے گئے۔ نواب محمود علیخاں نے چیخ چلا کے ندامت اور خجالت کا غصہ نوکروں پر اتار کے لڑکی کو کالے خاں باورچی کے سپرد کر دیا تھا، اور ہدایت کر دی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔ نواب صاحب کے ملازم بقدر حیثیت خود بھی آقا کے قدم بہ قدم چلتے تھے، زیادہ نہیں، تو گھر میں دو ہی بیویاں تھیں، لڑکی تھی کم عمر، ان دونوں نے اس خیال سے کہ کہیں سوتن بن کر نہ کھڑی ہو خوب ہی دُرگت بنائی۔ چڑھے شباب میں لڑکی ان کے

حوالے کی گئی تھی۔ سُگھڑ بیویوں نے سلیقہ سے شباب کو بڑھاپے میں بدلنا شروع کر دیا۔ چند سال میں لڑکی سے بڑھیا ہو گئی جوتے کھاتے خدمت کرتے پندرہ برس گذر گئے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو ہلکی روشنی میں ہر چیز خوشحال، تروتازہ شاداب ہوتی ہے بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ پھول مسکراتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے اور پھر چند ہی گھنٹے بعد چوندھیاتی دھوپ میں ہر چیز دمکتی ہے جھلستی ہے ہوائیں گرم اور خاک آلودہ ہو جاتی ہیں۔ چڑیاں اِدھر اُدھر چھپ جاتی ہیں پھول نڈھال ہو کر کمھلاتے اور گرتے ہیں، ہریاول پر دھوپ پڑتی ہے خاک چھاتی ہے، دن رات یہی قدرت کے پلٹے ہیں، پھر کونسی حیرت کی بات ہے۔ سرکس کی وہ تندرست، سیاہ چمکتی شوخ گھوڑی کانپور میں نیلام ہونے کے چند دن بعد یکہ میں جتنے والی گھڑیا ہو گئی اپنی پیٹھ پر کسی کو نہ بیٹھنے دیا تو کیا؟ کھڑ کھڑاتا بھاری یکہ دم کے پیچھے لگ گیا۔ اب ٹخ ٹخ گھڑیا سٹا سٹ چابک، دن بھر شہر کی گلیاں اور اسٹیشن کے پھیرے ہونے لگے۔ دن بھر کی تھکی شام کو گھر آئی، ڈھیر سی مَلائی ہوئی۔ تھوڑا دانہ تھوڑی گھاس ملی۔ رات بھر مچھروں نے کاٹا۔ صبح ہوئی پھر چل دی۔ شہر بھر کی خاک چھانتے، نہ شباب رکا نہ جوانی ہی رُکی۔ اس مار اور محنت سے دونوں ہی بھاگ گئے۔ بچھیری سے یکہ کی گھڑیا ہو گئی اسٹیشن پر جُتی، کسی کھڑی اونگھ رہی ہے۔ مزدوری مل گئی۔ سامان رکھا گیا سواریاں بیٹھ گئیں تو یکہ والے نے راس کو دو جھٹکے دیئے۔ چابک چلایا۔ ٹخ ٹخ کی۔ گھڑیا نے دُم ہلائی۔ سر اوپر نیچے اوپر نیچے ہلایا اور پھر منڈیا نیچے۔ غوطہ میں کھڑی ہو گئی۔ "او گھوڑی او گھوڑی تیرا ستیاناس ہو چل" ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔ سٹ چابک۔ سٹ چابک گھڑیا نے پھر دُم ہلائی۔ سر ہلایا۔ دم ہلائی۔ سر ہلایا۔ اور کھڑی ہے۔ پھر راس کو کرارے جھٹکے دیئے گئے۔ "او گھوڑی او گھوڑی چل تیرا ستیا ناس لگے، ٹخ، ٹخ۔ ٹخ ٹخ" اب پیروں سے زیادہ سر کو اوپر نیچے ہلاتی۔ ٹھمک ٹھمک گھوڑی چل پڑی تو اور سٹا سٹ چابک پڑنے لگے۔ "چل او گھوڑی چل چل چل۔ او گھوڑی۔ او گھوڑی تیرا ناس ہو۔ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ۔"

اسی ٹخ ٹخ میں گھوڑی کی عمر کٹ گئی۔ پندرہ برس ہو گئے بوڑھی ہو گئی۔ پیر کانپنے لگے۔ راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ ایک روز حسب معمول گھوڑیا یکہ کھینچتی ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ اسے روکا گیا۔ رک گئی مُنڈیا نیچی کر کھڑی ہو گئی۔ یکّہ پر پردے پڑے تھے۔ اس میں دو زنانی سواریاں تھیں۔ ایک مرد ساتھ تھا۔ مرد وُہی کالے خاں باورچی تھے، سواریوں میں ایک بیوی۔ دوسری گونگی ماما تھی۔ کالے خاں نے ایک دکان پر سے زنانے گرگابی جوتے لا کے پردے کے اندر سر ڈال کے بیوی کو دکھائے، ان میں سے دو پسند آئے پہن کر دیکھے، پھر ان دو میں سے ایک لینے کو بتا دیا۔ میاں جوتے لے کر پھر دوکان کی طرف چلے، بیوی کی نیت اس جوڑے سے اُس جوڑے پر ڈانوا ڈول ہوئی۔ اب کیا کرتی۔ گونگی کو اشارہ کیا۔ ”بلّا میاں کو بلا“ وہ بیچاری اپنی زبان میں چلائی۔ ”آوا وا۔ وا۔ آوا“ پژمردہ دل بوڑھی گھوڑی نے برسہا برس کے بعد پھر وہی آواز سنی۔ وہی آواز جو محبت کا پیغام تھی۔ وہ آواز جس سے زندگی کی پُرمسرت گذری ہوئی گھڑیاں وابستہ تھیں۔ یکایک یہ آواز جو آئی گھوڑی چونک دونوں کان پیچھے دیا خاموش کھڑی ہو گئی، بازار کی چیخ و پکار میں میاں نے آواز نہ سنی اس لئے گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔ گھوڑی نے کان آگے پیچھے ہلاتے ہوئے پھر اس آواز کو سنا۔ .... دُنیا کی کی تمام آوازوں میں یہی ایک آواز تھی۔ جو اس سے تعلق رکھتی تھی۔ برسوں سے اس کیلئے کان ترس رہے تھے، برسوں برسوں سے اس آواز کے سننے کی نا امیدی ہو چکی تھی۔ یہ آواز... یہ آواز..... لڑکی آ گئی۔ مل گئی۔ کہاں ہے؟ چلی جائے گی۔ پھر نہ ملے گی۔ کیا کروں۔“ غالباً کچھ اسی قسم کے خیال گھوڑی کے دماغ میں آئے ہوں گے۔ یا جو کچھ بھی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ دوسرا کے جو گھوڑی نے اس آواز کو سنا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس مریل گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔ اس نے ایک دفعہ ہنہنا کے تڑپ ماری۔ جال میں پھنسے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی۔ دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ گھوڑی آزاد بموں سے نکل یکّے کے چاروں طرف پھرنے لگی۔ وہ رکتی بھاگتی۔ کبھی الف ہوتی۔ کبھی دولتیاں چلانے لگتی، کان سکیڑے،

دانت نکالے، یکّہ کے گرد گھومنے لگی۔ چاروں طرف سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ لیکن سب خوفزدہ بھاگنے کے واسطے تیار دُور ہی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان ہی میں یکّہ والا اور میاں کالے خان باورچی بھی شامل تھے جو کہ فاصلے ہی سے نمایاں اچھل کود اور بلند تر چیخوں سے اپنی وابستگی اس غلاف پوش یکّہ سے ظاہر کر رہے تھے جو کہ اب ٹیڑھا بموں کو لٹکائے رکوع کی حالت میں خاموش کھڑا تھا۔ اور اس کے ارد گرد خوفناک وحشی کالی گھوڑی اس ارادہ سے طواف کر رہی تھی کہ اگر کوئی پاس آیا تو جان ہی لے لوں گی۔ اور سفید پردے کا یکّہ بیچ میں عجیب مظلومیت سے ساکت ٹیڑھا جھکا کھڑا تھا در اصل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ دعا مانگ رہا ہے۔ اس کے پردوں کے اندر بھی بالکل خاموشی تھی بیوی ڈر کے مارے بیہوش ہو چکی تھی۔ گونگی پردہ کا ایک کونا ہٹائے، یکّہ کے ڈنڈے پکڑے خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جو برابر ایک کے بعد ایک گالوں پر سے بہہ بہہ کر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف دو ہزار آدمیوں کا ہیجان تھا اور ارد گرد گھوڑی کے وحشیانہ کرتب تھے۔ اس نے اس وقت پھر اپنی پرانی دنیا کو زندہ ہوتے دیکھا۔ اس کے مردہ پیروں میں ایک روح سی دوڑی۔ وہ پردے ہٹا یکّے سے کود سڑک پر لمحہ بھر کھڑی ہوئی اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ بدصورت لاغر ادھیڑ عمر کی عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اچھل کر اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑی بھی جدھر اس کا منہ تھا ادھر ہی سیدھی سرپٹ دوڑی۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹتی چلی گئی اور گھوڑی تیر کی طرح نکل یہ جا وہ جا نکلی چلی گئی۔

بوڑھی عورت کو لئے بوڑھی گھوڑی بے تحاشا بھاگی۔ چوراہوں پہ ہوتی جگہ بہ جگہ گھومتی بازاروں میں کتراتی بھاگتی چلی گئی۔ محلوں پر محلے گذر گئے اور وہ بھاگتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ بھی آیا اور نکل گیا۔ اب لمبی سیدھی کالپی روڈ تھی۔ اس پر بھی وہ دونوں میلوں چلے گئے پانچ اور دس اور پھر پندرہ میل ہو گئے۔ تو پھر دونوں وہ مسکین بے زبان مسافر اصلی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ جدھر ہم سب دُنیا کے مسافر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ میل کے بعد بڈھی گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے۔ سرپٹ بھاگنے میں ٹھوکر کھائی۔ منہ کے بل

زمین پر گری۔ اس کا بھی سر پاش پاش ہو گیا۔ گونگی عورت کی بھی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی جس نے کہ گھوڑی سے بھی دس گز آگے پکی سڑک پر پٹخنی کھائی تھی۔

اے دوست! نہ رنجیدہ ہو۔ یہی وہ آخری منزلِ مقصود ہے جس کے حاصل کرنے کے واسطے یہ دونوں جُدا جُدا جی رہے تھے۔ ورنہ اور کیا تھا؟ کس کا آسرا تھا؟ کس حصول کی تمنّا تھی؟ شباب لٹ چکا تھا۔ جوانی اُجڑ چکی تھی۔ بڑھاپے میں ایک کہیں دوسرا کہیں کسی نہ کسی طرح راہی ملکِ عدم ہوئے۔ چند منٹ کی ہی سہی آخر یکجائی پھر ہوئی۔ پھر وہی شباب کا مشغلہ چندے نصیب ہُوا۔ اور یہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ڈراپ سین ہُوا۔

کفّارہ

ریل سے اُتر کر اگر شاہ گڈھ اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہو تو پانچ گاؤں چھوڑ کر اخیر گاؤں سکھ داس پور آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑے میدان کو پار کر کے نگاہیں ایک سبزی مائل سیاہ دیوار پر رُکتی ہیں۔ جو کہ دائیں ہاتھ پر شاردا نہر کی اونچی پٹری سے شروع ہو کر دائیں طرف دُھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصّہ ہے جسے مصطفےٰ آباد رینج کہتے ہیں۔ چونکہ اس جنگل میں چوپاؤں کی کثرت ہے، اس لئے اس میدان میں سوائے گیہوں کی ایک فصل کے اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح پر کہ کنارے کے تمام گاؤں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کنارے میلوں میل تک کانٹے دار درختوں کی شاخوں سے ایک باڑھ کھڑی کر دیتے ہیں جس سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لمبا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہی جگہ جگہ پر سانبھر[۱] اور چیتل[۲] منہ اونچا کر کے اپنے پھیلے ہوئے شاخدار سینگ پیٹھ سے ملا کر تھوتھنے بھر راستہ ڈھونڈھ لینے کے بعد بے تکلف اندر

۱؎ سانبھر سب سے بڑے قسم کا بارہ سنگھا ہوتا ہے مگر سینگ آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ چار شاخیں ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ جسم کا رنگ مٹیالہ ہوتا ہے۔

۲؎ سانبھر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ نر کے بارہ شاخیں ہوتی ہیں۔ کتھئی بدن پر سیاہ حاشیہ سے گھرے ہوئے سفید گل ہوتے ہیں۔

آجاتے ہیں۔ اُن کے پھیلے ہوئے سینگ کانٹے دار لکڑیوں کی دیوار کو چیر کر اُن کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں۔ رات بھر چرنے کے بعد دن پھوٹنے کی ہلکی روشنی پر یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھُس جاتے ہیں۔

ہولی کو جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں، چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ کانٹوں کی باڑھ سے کچھ دُور گھُٹنوں تک اونچے کھیت میں چھ[1] چیتلیں کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوُکھے گیہوں کے پتے ایک ایک کر کے بین رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے پر ایک جگہ فٹ دو فٹ کا گیہوں کا ایک گچھا، جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں۔ اب بھی سبز ہے۔ اس میں تین اور چیتلیں چمٹی ہوئی ہیں۔ ان کے برابر ہی کھیت سے باہر شاندار جھانک[1] موٹی گردن اینٹھائے پھیلے ہوئے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ ہاتھ، پیر، سر یا آنکھیں کسی کو بھی جنبش نہیں ہے، صرف کان وقتاً فوقتاً اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتہ چلا سکیں۔ ہوا بھی مخالف ہے۔ کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ اس لئے بُو بھی نہیں لے سکتا ہے کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دُور گھنے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی کھُس کھُس ہوتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھُٹ کھُٹانے کی آواز آرہی ہے۔ ان دونوں آوازوں کی اُسے مطلق پروا نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ یہ آواز نیولی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری آواز کھُٹ کھُٹ بڑھئی کے درخت کی چھال میں سے کیڑے چننے کی ہے۔ جھانک اس فکر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی سال[2] کے درختوں میں وہ جو زمین سے ملی لمبی سی چیز کے ہلنے کا شبہ سا ہوا تھا۔ دراصل وہ شیر ہی تھا یا کچھ اور؟ صرف ایک خفیف سی سُوکھے پتے کی پیر کے نیچے چُر چُرانے کی آواز اس کو سارا ماجرا بتا دینے کے لئے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا پیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال بنی کی تمام زمین پٹ جھڑ کے سُوکھے پتوں سے بچھی پڑی ہے۔ لیکن یہ دونوں بغیر ایک پتے کو بھی چُرمُرائے

---

[1] مادین چیتلیں کہلاتی ہیں اور اُن کا نر جھانک۔ [2] ایک قسم کی عمارتی لکڑی کا درخت۔

یا کُھس کُھسائے یہاں آکر دیمک کی بنائی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اسی گلّے کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔ چیتلوں اور ان کے درمیان بھٹ[1] کے چوڑے پتوں مروڑ پھلی[2] کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہو گئی کہ نظر ان دونوں کو بھی کچھ نہیں آرہا ہے۔ پھر بھی دونوں اطمینان سے دُبکے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوا میں جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ چیتلوں کی بُو اور اُن کے ہلنے جُلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

دفعتاً ہوا میں شیرنی کو ایک نئی بُو معلوم ہوتی ہے۔ گھبرا کر شیر کی طرف سَر گُھماتی ہے۔ شیر نے کوئی نئی بُو محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے کہ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ اب شیر کو بھی یہ نئی بُو معلوم ہوتی ہے۔ شیر جُھنجھلا کر دونوں کان آگے جُھکاتا ہے، لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے۔ اب شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی، دونوں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے گھوم کر شمال سے مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے۔ سبز گُچھے پر اب بجائے تین کے پانچ چیتلیں پُھدک رہی ہیں۔ باقی چار ان ہی سُوکھے گیہوُں میں سے پتے کھا رہی ہیں چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بُو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سَر اونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چیتل کو دُور سُکھ داس پور کی سمت دُھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ چیتل فوراً "کُو" کی لمبی آواز لگاتی ہے۔ سُنسان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں چونک کر سَر اونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھُوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور

---

[1] جنگلی پودا، پتے بڑے ہوتے ہیں۔ پودا فٹ ڈیڑھ فٹ اونچا ہوتا ہے۔

[2] جنگلی سَن، یہ جھاڑوں کی طرح اُگا ہوتا ہے۔ چار سے پانچ فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔

پانچ منٹ تک پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں۔ بُو برابر آ رہی ہے لیکن دُور ہلنے والی چیز رُک گئی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے۔ سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹتے ہیں۔ کانٹوں کی باڑھ جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل ان ہی میں سے ایک راستے سے ایک کے بعد ایک قلانچیں بھرتے نکلتے ہیں۔ سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے جو کہ چیتلوں نے بنا لی ہے۔ جنگل میں گھُستے گھُستے وہی چیتل پھر دو دفعہ "کُوکُو" کی آواز لگاتی ہے اور سب چیتل جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں سامنے کچھ دُور سوکھے گیہوں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

—————— .... ——————

پھانسی کے تختے پر بے کسی اور بے بسی کی موت سے بچنے کے واسطے بہاری گاؤں سے بچتا ہوا شاہ گڑھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔

اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ دامن پھیلائے اس کو اپنی گہرائیوں میں چھپانے کے واسطے تیار کھڑے تھے لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اُس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اُس کی پشت پر گاؤں کی اِکا دُکا ٹمٹماتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اُس کے سامنے وہ جنگل جس کو یہ زندگی کا گہوارہ سمجھ کر جُویا ہوا تھا قبر کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا آنکھوں سے اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ نہ ناک سے کوئی بُو محسوس کی تھی۔ صرف چیتل کی کوکیں سُنی تھیں، اور ان ہی تین آوازوں نے اُس کی خیالی جنت کو ہیبت ناک گھنا بن بنا دیا تھا۔ بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا۔ بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن جنگل سے ناواقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کو پھر آگے پیچھے چاروں طرف موت نظر آنے لگی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔ اپنی بے کسی پر اُس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا ہیجان تھا کہ وہ کسی ایک بات کا لگاتار سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنی بدقسمتی کا خیال کرتا تھا کبھی بے کس بڈھے باپ اور ماں کی

حالت سوچتا تھا۔ کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تھا۔ اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آجاتی تھی۔ "چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈھ ہے، اس پر ایک آدمی خون میں نہایا اوندھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈاسہ لئے کھڑا ہے۔" اس تصویر سے بہاری لرز جاتا تھا۔ کانپ اٹھتا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ نہ سوچے مگر بار بار یہی خیال آجاتا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا۔ بلدیو سنگھ کا قاتل میں ہوں تو سہی لیکن ہے رام یہ کیسے ہوا۔۔۔۔۔ کیسے ہوا؟۔۔۔۔۔ ہاں میں نے مارا۔۔۔۔۔ ڈو گنڈاسے سر پر ہلکے سے مارے تھے اور تیسرا ہی زور سے مارا جو پیٹھ میں گھس گیا۔۔۔۔۔ اس ہی سے تو گر پڑا۔ پیٹھ کا زخم؟۔۔ نہیں پیٹھ والے سے کیا ہوا۔۔۔۔۔ وہ تو پہلا ہی گنڈاسہ سر میں گھس گیا۔۔۔۔۔ میں نے مارا؟ ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ ۔۔۔۔۔ ہے رام یہ کیا ہو گیا؟ ۔۔۔۔۔ ہرے رام یہ کیا ہو گیا؟۔۔۔۔ ہے بھگوان، اب وہ زندہ ہو سکتا ہے؟ ۔۔۔۔ ناہیں ناہیں! ۔۔۔۔۔۔۔ ہے بھگوان!۔۔ معافی مل سکتی ہے؟ ۔۔۔۔ ناہیں! ناہیں!! ۔۔۔۔۔"

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصور پیش کر دیا۔ کیا دیکھتا ہے، بلدیو سنگھ کا باپ اُس کے سامنے لڑکے کو لئے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔ "کنور بھیّا لو ہے بہاری تمرے سامنے! اب ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جائی ہو۔" بلدیو سنگھ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے وہ آنکھیں بند کئے سامنے کھڑا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھ لیتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ باپ دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑے کھڑا ہے اور برابر کہہ رہا ہے: "بس کنور اب جان دیو، ماپھ کر دیو۔ اچھے ہوئی جاؤ۔" پھر بڈھا اُس کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہتا ہے۔

"بہاری تم بھی ماپھی مانگ لیو بیٹے کا دیکھ رہے ہو۔ مانگو ماپھی۔" بہاری ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلدیو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے۔ "معاف نہیں کروں گا۔" اب بہاری اُس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے۔ "میں نا معاف کروں گا۔ بلاؤ سپاہیوں کو۔

پکڑو۔ پکڑو۔ دوڑو اسے پکڑو۔" بہارؔی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسوں آدمی دوڑے چلے آرہے ہیں۔ وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ صبح کی سہانی روشنی اُسے بھیانک معلوم ہوئی۔ سنہرا زرد گیہوں کا کھیت موت کے ہاتھوں مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا۔ کالا جنگل کا کنارہ ایک قلعہ معلوم ہوا۔ جس میں اس کو موت سے پناہ مل سکتی تھی۔ یہ فوراً اس کی طرف لپکا۔ لیکن چار قدم چلنے کے بعد اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے درختوں میں سے جھانکتے ہوئے سُکھ داس پور کے مکانوں پر اُس کی نگاہ پڑی۔ ہر مکان اُس کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہارؔی جنگل کی طرف بھاگا۔ کانٹوں دار باڑھ کو پھاندتا ہوا جنگل میں غائب ہوگیا۔

جس وقت دوبارہ مرغے نے اذان دی تو بہارؔی نے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کا ہلکا نور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سمیٹے ہوئے پر پھڑپھڑا رہا تھا، اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی چڑیا۔ "چیں چوں، چیں چوں" چہک رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں بہارؔی نے دن بھر کے سُکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ وہ "اے بھگوان۔ کر پا کر بھگوان" کہہ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے وہ رسّی کھولی جس سے کہ اُس نے اپنا سینہ اور کمر برگد کے دُو شاخے سے باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سوتے میں درخت سے نہ گر پڑے۔ بہارؔی کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہیں اُس نے مروڑ پھلی کی چھال سے یہ رسّی بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر ہولوں کی طرح بھون کر کھا لیتا ہے، اور پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیوں میں اپنے کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلتے ہی پھر اندر گھنے میں گھُس کر جنگل سے گھری ہوئی چانڈر میں چھُپ جاتا ہے جنگل کا جو تصور اُس نے باندھا تھا یہاں آکر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال کا جنگل دراصل

لے سبز چنوں کو آگ میں بھون کر ہولے بنائے جاتے ہیں جو یوپی کے دیہاتیوں کا من پسند کھاجا ہے۔

ایک میدان کی طرح تھا۔ جس میں فٹ سوا فٹ اونچے بھٹار اور کریاری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ننگے بلا شاخوں کے تنے کھڑے ہوئے پچاس ساٹھ فٹ کے اوپر چھتری نما چند ڈالیوں سے ایک چھت تھامے ہوئے تھے۔ رات کو ان درختوں پر چڑھ رہنا اور دن میں اُن کے نیچے زمین پر پھرنا ناممکن تھا۔ آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گائے اور بھینسوں کے گلّے اور چرواہے آجاتے تھے۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھجیاں بھی تھوڑی دُور پر تھیں۔ لیکن دن میں اُن میں چھپنا ممکن اور کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے مشرق میں ساروا نہر کی شاخ ہردوئی برانچ بہہ رہی تھی اور مغرب کی طرف ناقابلِ گزر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاندر تھا۔ اسی چاندر کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گڈھا تھا۔ جس کے کنارے دلدل یا کیچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بھارتی دن گزارتا تھا۔ نیچے کیچڑ میں جوکیں ہاتھ پیر اور پیٹھ پر ڈانس اور آنکھ کے آگے صدہا بھُنگے اُسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاندر صدہا جنگل سینٹوں پناوروں اور گھاسوں کا ایک اُبسا اونچا اور گھنا ٹکڑا ہوتا ہے۔ جس میں کہ انسان کو پُورا پیر رکھنا محال ہوتا ہے۔ اونچائی میں ہاتھی مع ہودے کے اس میں چھپ جاتے ہیں۔ چاندر میں کبھی کوئی ایسا قدآور درخت نہیں ہوتا جس پر کہ انسان چھ سات فٹ بھی اوپر چڑھ سکے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ چاندر کی ٹٹھیرے نما گھانسوں کو کچل کر دو فٹ جگہ بنا لے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ بغیر کسی مضبوط ہتھیار کے نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہے۔ ہُولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سُکھا دیا ہے۔ یہاں نہ اب چڑیاں چہچہاتی ہیں نہ کالا تیتر بولتا ہے۔ کھڑکھڑاتا ہوا بھُورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر ہے جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہنچ کر اُن مُردہ گھانسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہنچا دیتی ہے اور جب چاندر جل کر بھوری اور سیاہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اُس کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں۔۔۔ ظالم۔۔۔۔۔ ظالم۔۔۔۔۔ قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

چاند اُگتا ہے ...... وہ ہستیاں جو کبھی حیات کی طالب نہیں ہوئی تھیں، حالت بے خبری میں وجود میں لا کر اس دنیا میں گرم و سرد جھونکے برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عرصۂ حیات کم ہے۔ مصائبِ عالم بھی ہیں، موسم کی سختیاں بھی ہیں۔ وجود کی جد و جہد بھی جاری ہے کہ بیڑا پار لگ جاتا ہے اور پھر وہی ہوتا ہے ...... ظلم ...... ظلم ...... قدرت کے قوانین کیسے ظالم ہیں۔ قد آور درخت، چھوٹے پودے، لاکھوں قسم کی گھاسیں۔ بڑے بڑے جانور اور درندے، چوپائے اور پرندے۔ چھوٹے چھوٹے جانور، کروڑ ہا قسم کے کیڑے اور انسان سب اسی قانون کے تابع پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چکی چل رہی ہے۔ دانے ڈالے جا رہے ہیں۔ آٹا نکل رہا ہے۔ شاید یہ عالمِ ہستی خود کسی گناہِ عظیم کا کفارہ ہے ......!

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں رسی لئے دوسرے ہاتھ کی اُنگلی سے برگد کی چھال کو کُریدتا ہوا اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ جنگل کی اس زندگی سے اتنا عاجز آچکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے کسی گاؤں میں جا کر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا اور پھانسی پر بھی لٹکنا پڑا تب بھی گوارا تھا۔ لیکن وہ تکلیفیں جو اب وہ اٹھا رہا تھا ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اُس کے پاس سوائے ایک ماچس کے بکس کے اور چند بےکار روپیوں کے کوئی چیز نہ تھی کاش کہ ایک چاقو ہی ہوتا۔ دیا سلائیاں بھی ختم ہونے کے قریب آچکی تھیں۔ دیا سلائی کا خیال آتے ہی اُس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب سے ماچس کا بکس نکال کر اس کی تیلیاں گننے کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اس کو جیب میں رکھ کر "بھگوان۔! دیا کرو بھگوان" کہتے ہوئے درخت سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ جب آخری ٹہنے پر آگیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں لٹک گیا۔ اُس کے پیر اب بھی زمین سے چار فٹ اونچے ہوں گے کہ اُس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور دھم سے زمین پر آ رہا۔ سنبھل نہ سکا ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اُس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلہ پر ایک عورت کی "ارے دیّا" چلانے کی آواز آئی۔ سر گھما کر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرنے سے لٹیا وٹیا چھوڑ کر بھاگی چلی جا رہی ہے۔ بہاری بھی گھبرا کر اٹھا جنگل کے اندر کی طرف بھاگنے لگا مگر فوراً ہی لٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اس تک گیا اور اُسے اٹھا رہا تھا کہ کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی۔ اُس نے اسے

بھی اٹھالیا۔ اور لُٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت کو بھاگا۔ فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دُور میں سانس پھول گیا۔ بھاگنا بند کر دیا۔ تیز قدم اٹھاتا اُسی چاندر میں گھُس گیا۔

چاندر میں پہنچ کر بہاری نے اس پوٹلی کو کھولا تو اس میں سے ایک کھُرپی، ایک ہنسیا، چھٹانک بھر کے قریب تمباکو۔ چلم۔ ایک دیا سلائی کی ڈبیہ اور کوئی سوا سیر آٹے کی روٹی اور بینگن کی بھاجی نکلی۔ بہاری نے فوراً کھُرپی اور ہنسیا کی مدد سے چاندر میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی۔ اس کے بعد لُٹیا میں پانی بھر کر لایا۔ آٹھ دن ہو چکے تھے سیر ہو کر روٹی کھائی۔ پھر آگ جلا کر چلم بھری اور اطمینان سے پیتا رہا۔ عرصے کے بعد یہ نعمتیں ملیں۔ روٹی اور تمباکو دونوں کا نشہ چڑھا، تو وہ وہیں پڑ کر سو گیا۔ دن کے دس بجے سویا، شام کے چار بجے اٹھا۔ درخت پر نیند کہاں بھرتی تھی۔ اب جو سو کر اٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح کی بشاشت تھی۔ صبح کو ہراساں ہو کر وہ گاؤں میں جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تھا لیکن اب اُس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا۔ ہنسیا کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت اُسے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیہوں کھیتوں سے کاٹ سکتا ہو کاٹ کر جنگل میں کہیں چھپا دے۔ ورنہ جب گیہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائے گا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اس نے تصفیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے فی الحال تو جنگل ہی میں چھُپا رہے۔ بہت دِنوں کے بعد پیٹ بھر روٹی نے اس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ آئندہ کے منصوبے گانٹھتا ہوا نکل کر چاندر سے جنگل کی سو فٹی[1] سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ آ رہا تھا کہ اُس کے بائیں ہاتھ کی طرف

---

[1] اودھ کے تمام جنگلوں میں محکمۂ جنگلات کے انتظام سے سڑکیں کٹی ہوئی ہیں۔ ان میں بعض ایسی ہیں جن پر موٹر چل سکتے ہیں ورنہ زیادہ تر جھاڑیاں اُگی ہوتی ہیں۔ اُن سڑکوں سے آگ کا بچاؤ اور جنگل کے ٹکڑوں کی تقسیم وغیرہ کا فائدہ ہے۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر اُس کی نگاہ پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آ رہا ہے۔ سر سے پیر تک پسینہ آ گیا۔ بُت بن کر جہاں کا تہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بہارسی کو یقین سا ہو گیا تھا کہ اس جنگل میں شیر یا بھیڑیا کوئی نہیں ہے۔ آج اُس نے پہلی دفعہ شیر کو دیکھا تھا۔ لیکن شیر اس کو دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا اور آج تیسری دفعہ آمنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر نے اُس کو دیکھ کر اپنا بھاری شاہانہ چہرہ تمکنت سے پیچھے پھیر کر ایک لمحہ کے واسطے کچھ دیکھا اور پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا بالکل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہارسی سکتہ کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک اور شیر تیز قدم آ رہا ہے۔ یہ شیرنی تھی۔ پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ جونہی شیر کے قریب آئی اس کی بھی نگاہ بہارسی پر پڑی۔ ہلکی سی غراہٹ اس کے منہ سے نکلی۔ شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جونہی شیرنی اُس کے بائیں ہاتھ کی طرف برابر میں آئی۔ شیر پاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا۔ اور ناراض شیرنی کو اپنے پہلو سے ڈھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہارسی کے اس قدر اوسان خطا ہو گئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کدھر جائے۔ کیا کرے۔ آخر کار پھر روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اس کی پشت پر مُور چلایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں شیر اُس سے کترا کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چل کر پھر سڑک پر نکل آئے تھے۔ اور اس طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہارسی کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصہ دونوں ہی کو آ رہا تھا۔ مگر شیر سمجھدار مطمئن طبیعت کا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ معاملات نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ملکہ پیٹ سے ہے۔ تنہائی کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کانگڑ اور پاڑے جو اس ٹکڑے میں مستقل طریقے سے رہتے تھے کوچ کر گئے ہیں اور نہ صرف یہی بلکہ چیتل اور سانبھروں کی ٹولیوں نے بھی ادھر کا آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس ٹکڑے کو چھوڑ کر چوکاڈھایا کے نزکلوں میں رہا جائے۔ چنانچہ وہ شیرنی کو لئے نکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں سارده کی (اصلی نہر) کینال پر پہنچ گئے۔ سامنے چوکاڈھایا کا پل تھا۔ مگر ان کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دو سو قدم ادھر ہی نہر میں انہوں نے پانی پیا اور پھر تیرتے

ہوئے پار نکل گئے۔

رات گئے تک بہاری گیہوں میں لگا رہا تھا۔ صبح دھوپ نکل آئی تھی اس کی آنکھ کھلی اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ دُور کھیت میں تین چار لال صافے دیکھ کر اُس کی روح خشک ہو گئی جلدی سے رسی کھول کر درخت سے نیچے اترا۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کروندوں کی گھنی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آڑ کر رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مارے ڈر کے سانس بھی پوری نہ لیتا تھا دل کی دھڑکن سے مجبور تھا۔ جس کی آواز اس کو نقاروں کی چوٹوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اُسی کی طرف بڑھتی سنائی دیتے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس نے کہا "ہے رام ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن۔ میری کیا دِشا ہو گئی ہے۔ میں نے کس جنم میں کونسوں پاپ کئے تھے۔" اس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اس کے سامنے کر دیا جبکہ اس کا گنڈاسہ پہلی دفعہ بلدیو سنگھ کے سر میں کھسکھساتا ہوا گھستا چلا گیا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کو تیز دھار کے زندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس ہونے لگا۔ بہاری نے پھریری لے کر اس خیال کو مٹا دیا اور نہ معلوم کیوں اور کس لئے وہ اپنے آپ سے ہی بحث کرنے لگا۔

"میں مجرم ضرور ہوں لیکن سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی اور اگر بلدیو سنگھ کے باپ نے میرے اوپر اس قدر ظلم نہ کئے ہوتے۔ بے دخل کیا، زمین چھینی، باغ چھینا۔۔۔ لیکن اس کا بدلہ۔۔۔۔۔ لڑکے کو مار ڈالا؟۔۔۔۔۔ قتل! قتل؟۔۔۔۔۔ قتل؟۔۔۔۔ ہاں قتل!۔۔۔۔۔ میں نشہ میں تھا پھر اسی حالت میں رمضانی نے آکر جوش دلا دیا۔۔۔ جمنا میری منگیتر ہے۔۔۔۔۔۔ میری منگیتر ہے۔۔۔۔۔ اُس کے گھر میں بھی تو بلدیو تھا۔۔۔۔۔ جمنا۔۔۔۔۔ اب کس کی ہے؟۔۔۔۔ ہے رام کرپا کر۔۔۔"

بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے

بڑے داروغہ...... خاں کی آواز آئی۔ "پاگل ہوئے ہو۔ کہیں ڈاکو کھیت کاٹتے ہیں؟ گیہوں چراتے ہیں؟ ڈاکو ہوتا تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا۔

ایک آواز:۔ سرکار اِکل لا ہے۔ ساتھ ماں کوؤ نا ہے۔ (سرکار اکیلا ہے ساتھ میں کوئی نہیں)

بڑے داروغہ:۔ ہاں بے ہاں اِکل لے ہی واردات بھی کیا کرتے ہیں۔ اِکا دُکا راگیروں کو لوٹتے ہیں۔ سوتوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔ کہیں گیہوں چراتے ہیں اور ایسا ڈاکو کہ سالے کے پاس چاقو تک نہیں۔ کیوں جی پہلے تو ہاتھ ہی کی توڑی بالیاں تھیں نا؟ ٹھیک سے دیکھا تھا؟ پہچان لیتے ہو ہاتھ کی ٹوٹی؟"

ایک آواز:۔ ارے حجور ہم دیکھ کے بتائی دیں۔ کوؤ جناور نے کھائی، کوؤ ن ہنسیا کاٹی مُل سرکار یہ ہئی کوؤن بڑا۔ (ارے حضور ہم دیکھ بتا دیں کس جانور نے کھائی کس ہنسیا نے کاٹی)

بڑے داروغہ:۔ کوئی بالکل نیا مجرم ہے۔ ضرور خون کر کے بھاگا ہے۔ ہو نہ ہو وہی مفرور قاتل ہے۔ کیا نام تھا جی؟ گشتی چٹھی پڑھی تھی۔ یاد ہے؟

ایک کانسٹبل کی بھاری آواز:۔ بہاری ولد مہابیر ساکن مکروان۔ مقتول بلدیو سنگھ۔

ایک آواز:۔ داروغہ جی اتنے نا مُلئے چاندر ماں۔ نہیں تو کھیرے ماں ہوئیے، اُتے چلو۔

داروغہ جی:۔ ابے اُلّو کی دُم یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ یہاں تو پیروں کے نشان دیکھنا چاہتے ہیں اور چاندر میں جا کر کیا چھ آدمی ڈھونڈھ لیں گے؟ پانچسو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ یہ تو گاؤں ہی میں پکڑا جائے گا۔ تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائے گا۔ تم لوگ خیال رکھنا جو پکڑ کر لائے گا یا اطلاع دے گا اُسے بہت انعام ملے گا۔

جان۔ جان۔ دنیا بھر سے زیادہ پیاری جان۔ تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے اندھی لنگڑی بڑھیا سسک سسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن! عشاق کے ہجوم، عیش و عشرت، روپیہ پیسہ، بال بچے، گھر بار سب رخصت ہو گئے۔ کچھ نہ رہا۔ اب کیوں جی رہی ہے؟ کس کا انتظار ہے! گئے دن واپس آنے کی امید ہی نہیں۔ پھر کیوں جی رہی ہے؟ جان! سب سے پیاری جان باقی ہے۔ اس ہی کو گھرے داموں پالتی ہے۔

الوداع! اے انسان کی بستیوں الوداع! بہار بھی اب کبھی تمہاری طرف رُخ نہ کرے گا!

انسانی رہ گذر سے کوسوں دُور گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں اور طرح طرح کی فرنوں سے ڈھکا چوکا ڈھایا ڈھلوان اُترتا ہوا اپنے میں ٹھنڈی سبز بید کی جھاڑیاں شامل کر لیتا ہے تو پھر وہاں انتہائی گھنا پندرہ فٹ اونچا نرکل کا تختہ اُس سے آملتا ہے۔ جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگیں لگی ہوتی ہیں تو یہاں مہکتے ہوئے پھولوں میں صدہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھچاندی بھچاندی بُو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل بچھا کر شیر اور شیرنی نے تھوڑی سی جگہ بنا لی ہے۔ اور اس ٹھنڈے اور روشنی سے محفوظ گھر میں شیرنی نے بچے دیئے ہیں۔ جن کو وہ لیٹی ہوئی بڑے غرور سے دیکھ رہی ہے۔ اُس کی پشت پر شیر غافل سو رہا ہے بچوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں...... وہ آپس میں کھیل رہے ہیں۔ سنہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شام ہو گئی ہے شیرنی کو انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ[1] لائن سے کچھ دُور روہنی[2] کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانبھر اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لے کر لیٹے سے سر اُٹھا کر اس کو اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکولا دے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ گول مٹول بھورے دونوں بچے جو اُس کے اوپر سوار ایک دوسرے پر داؤں لگا رہے ہیں۔ لد لد زمین پر گر کر لڑھک جاتے ہیں۔ جیسے ہی شیر اٹھ کر بیٹھتا ہے۔ شیرنی نرکلوں میں آمد و رفت سے بنی ہوئی گلی کا رُخ کرتی ہے۔ شیرنی چونکہ دُودھ پلا رہی ہے۔ اس کی

---

[1] سانپ لائن وہ سڑک ہے جو ڈھائے کی آدھی اونچائی پر کاٹی گئی ہے۔ چونکہ ڈھایا ٹیڑھا میڑھا ہے اسلئے یہ سڑک بھی سانپ کی طرح لہرائی ہوئی ہے۔ سڑک سے کہیں بھی اصلی سڑک کی مراد نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک راستہ ہے جس پر سے درخت کاٹ دیئے گئے ہیں۔

[2] ایک جھاڑی جس کے پھولوں میں سے سُرخ رنگ کی ایک دوا نکلتی ہے۔ نہ معلوم یہ دوا کس کام آتی ہے۔ پہاڑی اسے جمع کرتے ہیں۔

اشتہا بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بھوکی ہو رہی ہے۔ آخر شیر بھی روانہ ہو گیا۔ جب نرکلوں سے باہر آگیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھر لی اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چل دیا بید کی جھاڑیوں سے نکل کر جونہی یہ دونوں سانپ لائن پر آئے ایک ساکھو کی ساٹھ فٹ کی بلندی سے مُور نے "می اوں، می اوں" کے نعرے لگائے۔ ہلدو کی درخت پر بیسیوں بندروں کی ٹکٹکی بندھ گئی۔ ان دونوں کو آج شکار تو مارنا نہ تھا۔ چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہ تھی اُن کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہو گئی تو ہو جائے۔ اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے، اور جب روہنی کے جنگل کے نیچے پہنچ گئے تو باری باری ایک جست لگا کر ڈھائے پر چڑھ گئے اور روہنی میں تھوڑی دُور چل کر سانبھر کی بچی کھچی ٹٹھری پر پہنچے۔ لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شاہانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصہ کا تغیر پیدا ہو گیا۔ شیر غضب ناک ہونے لگا۔ اس کی نرم و نازک لچکتی ہوئی ملکہ خونخوار جھنجھلائی ہوئی شیرنی ہو گئی...... گوشت چرایا گیا ہے... انسان کی بُو آ رہی ہے...... شیر کی سیدھی دم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہرا کر طبیعت کے انتشار کو ظاہر کرنے لگی۔ شیرنی کو غصہ زیادہ تھا۔ ناگن کی سی دُو پھنکاریوں کی سی آوازیں اس کے منہ سے نکلیں۔ وہ سانبھر کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیوں کو سونگھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی۔ پھر ایک طرف روانہ ہو گئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لے گی۔ یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔ لیکن اب اس پر پھر وہی فطری متانت آگئی تھی۔ وہ بڑھ کر شیرنی کے آگے ہو لیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ کے بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی پتاور سے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر سر نکالا۔ دو سو قدم پر سامنے بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا۔ اور اسی طرف کتا ہوا شیرنی کو نہر کی پٹڑی پر نکال لے گیا۔

"پ"

اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کر سکتی ہے تو ترائی کے جنگلوں ہی میں جنہوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ (جنگل کے تمام جانور انسان سے اسقدر ڈرتے ہیں گویا انسان کا مارنا ان کو حرام ہے)۔

شام کے وقت چوکا ندی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہو تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قد آور درختوں کے تنے ہی تنے اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صدہا جھاڑیاں ان پر بیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہری کچی بید کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختے پر میلوں جاکر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دُور دراز جنگل میں مل جاتی ہے جو کہ فاصلہ کی وجہ سے دھندلا غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے۔ دفعتہً ایک مرغی کڑکڑاتی ہے اور اس کے بعد ہی مور چلاتا ہے "می آؤں، می آؤں" اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سین ایک ہی وقت میں انتہائی دلفریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی۔ انسان خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگنا بھی چاہتا ہے اور ہٹنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا ہے اس کی دلفریبی بھیانک پن میں بدل جاتی ہے۔ جوں جوں شام ہوتی ہے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور جھٹپٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیانک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کمبل اوڑھ کر منحوس شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے واسطے تڑپتا ہے۔ وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اور جب ایک دفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہم جنسوں میں جا بیٹھتا ہے تو اس کا دل خود بخود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں پیاری جان کا حفاظت کا جذبہ بہاری کے دماغ کو ان احساسات سے معطل کر چکا ہے۔ انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہو چلے ہیں۔ ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کر رہی ہے۔ سر اور داڑھی کے خودرو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے سے بہت کچھ جدا معلوم ہوتا ہے کمرے سے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چند لیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ حرکات میں وحشت، چال میں چیتے کی سی جھپک! اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھ کر بجائے اپنی بدقسمتی کے واقعات سوچنے کے جنگل کی

آوازوں پر کان لگا کر اُن کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھ کر پرندوں کے انڈے! بسیرا لیتے پرندے، مرے گرے جانور! اور دوسروں کا مارا شکار کھاتا ہے۔

ایک دن حسبِ دستور جب مور نے کوک کر! میناؤں نے شور مچا کر اور بید کی رہنے والی مرغیوں نے کڑ کڑا کر اطلاع کر دی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کر کے دن بھر سونے کے واسطے نرکلوں میں گھس گئے ہیں اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اترنا شروع کیا تو بھارتی بھی درخت سے اترا۔ رات کو سانبھروں کے بے تحاشا بھاگنے۔ چیتلوں کے "پوق پوق" چلانے کے بعد چوکا کی طرف شیر کے فتحمندانہ گرجنے کی آوازیں سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے واسطے یہی تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈھ لے جس کو کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ بھارتی اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن ڈھل گیا۔ یہ ناامید ہو کر اس جستجو کو دوسرے دن کے واسطے ملتوی کرنے ہی کو تھا کہ شکار کی گھسیٹنی پر اس کی نگاہ پڑ گئی۔ فوراً بھارتی نشان پر روانہ ہوا۔ نرکلوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن پر سے ہو کر جہاں نرکل ختم ہو کر پانی اور کیچڑ میں گھنا پٹیرا تھا۔ یہ جا پہونچا۔ اب گوشت کچھ دور نہ تھا۔ ضرور اسی پٹیرے میں ہوگا۔ ایک کوّا ابھی وہاں بیٹھا تھا۔ لیکن شام ہو چلی تھی۔ وہاں جانا مخدوش تھا۔ شیر کے نکلنے کا وقت آگیا تھا۔ مگر بھارتی کو دن کا فاقہ ہو چکا تھا۔ اس نے ہمت کی کہ جلدی سے تھوڑا سا گوشت کاٹ لائے۔ پانی میں چھپ چھپاتا پٹیرے کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا تیزی سے بڑھا پتوں سے ڈھکے سانبھر تک پہنچا تھا کہ دور مور چلایا۔ مرغیاں کڑ کڑائیں۔ بھارتی سانبھر پر جھکا ہوا تھا۔ تین سیکنڈ کے واسطے ٹھٹک گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چری ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر بھارتی بھاگا۔ پیٹرے سے نکل، جھاڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو دہنی

شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش۔ بجلی سی کوندی۔ چارمن کا شیرنی کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہارتی پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سینٹوں کی طرح چرچراتی چلی گئیں۔ بہارتی شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسے پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان واقعات سے بے خبر ٹہلتا ہوا جیسے ہی قریب آیا ٹھٹھک کر رک گیا۔ شیرنی نے لاش کو اس طرح منہ میں اٹھا لیا جیسے بلی نیم مردہ چوہے کو۔ اور جھٹکے دینے لگی۔ شیر کے منہ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہارتی کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور لٹکتے ہوئے ہاتھ ہلتے دیکھ کر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین[1] اس طرح شکن ہوتے دیکھ کر تھرا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور "خوں، خوں، خوں، خوں" غراتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اُتر کر پیٹر ے اور اس کے بعد کلک کے جنگل میں سے نکلتا ہوا چوکا کے ٹھوکر نیپال کی طرف نکل گیا۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب صفت ہوتی ہے۔ جس طرح کتے کے کاٹے سے انسان بورایا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بَورا جاتے ہیں۔ پھر ان کو ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بَن رکھے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اس کو اور آدمی چوکا ڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ نہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے ملے۔ مینا کوٹ کی زمینداری جنگل میں آگئی۔ یہاں آکر اس نے متواتر کئی خون کئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ہاکا

---

[1] جو لوگ جنگلوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس کس طرح شیر اور ہاتھی تک انسان کو چھوڑ چھوڑ کر کترا جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے ایک چاندر میں تازہ مرا ہوا سانبھر ملا۔ سینگ بہت اچھے تھے میں اور میرا ملازم سر کاٹنے کے واسطے اُس پر جھکے۔ آٹھ نو فٹ کے فاصلہ سے شیر نے غرا کر ڈانٹا۔ اور حملہ تب بھی نہ کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ دہلی اور بمبئی کی سڑکوں سے کہیں زیادہ محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔

کر کے طرح طرح کی آوازوں سے ڈرا کر اُسے نئے اُگے چاندر سے نکالا۔ دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ جوں ہی یہ بچوں کو لئے چاندر سے نکلی سامنے درختوں پر بندھے ہوئے مچانوں سے تڑاتڑ بندوقوں کے فیر ہوئے۔ دو گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے بچے کے۔ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمودؔ کی گولی گردن پر اور احمد میاں کی پاکھے پر کبھی خطا ہی نہیں ہوئی۔ دوسرا بچہ پھر چاندر میں گھس گیا جو کہ کملی اور کپڑے ڈال کر زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔

آج اس واقعہ کو برسوں گذر گئے ہیں۔ اب بھی کہیں ایک سفید بڈھا لکڑی ٹیکے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھ کر اپنے اکلوتے بیٹے بلدیو سنگھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔" ہے بھگوان میں نے کونوں پاپ کئے تھے جو مجھے یہ سزا ملی"۔ اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنے لاغر جسم کو لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹہرے کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے اور جب سلاخوں میں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو بیٹھ کر کسی دور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے۔ تماشائی تالیاں بھی بجاتے ہیں کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اس کو خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے۔

شیر کیا سوچتا ہوگا.................؟

یا رب! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے!!۔

کلوا

منہ پر پسینہ، گالوں پر سُرخی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے۔ قمیص کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے، ازار بند پیروں تک لٹکا ہوا، ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتے کا پلّا، مُنّن گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے چیخ ماری۔ "اے ہے میں مر گئی۔" سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہینڈل پر تھا دوسرا ماتھے پر! وہ ساکت بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا، اور بھاری آواز بنا کر بولا۔ "اماں ہم اسے پالیں گے۔"

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے خدا کیلئے گود سے تو پھینکو۔" کچھ خفگی کی آواز میں۔ "سارے کپڑے نجس کر لئے پھینکو اسے۔ تمہارے ابا آتے ہوں گے۔"

لڑکے نے جلدی سے پلّے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلّا تین انچ کی دم ہلا ہلا کر مُنّن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانے سے گردن باہر نکال کر ناک پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "بیوی دیکھئے تو مُوا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے۔" دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلّائی۔ "لو یہ بھی چلیں، اب گھر بھر گندا ہوگا۔ مُنّن تم یہ کیا مصیبت لے آئے!"

مُنّن نے کہا "بٹّو" کاٹ کھائے گا اِدھر نہ آنا۔"

ڈیڑھ گھنٹے بعد مُنّن منہ دھوئے، صاف کپڑے پہنے، اُجلے بنے، چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ہلکی نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مراد آبادی تھالی میں دو بسکٹ تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا۔ جس پر تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتے کی

طرف مشغول تھے۔ کتے کا پِلا صحن کے دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں دھجی سے بندھا ہوا ایک ہڈی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے تڑئیاں چھیلتے ہوئے کہا۔ "اب ناشتہ کرلو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکا رہے ہو، دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی۔"

"اُماں اس سے ہڈی تو چبتی ہے نہیں۔ بسکٹ دے دوں۔" یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لے کر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا۔ "چلے پھر چھونے کو۔ ارے تم کھا تو لو، ہیں اور....."

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی۔ سیاہ فریم کی عینک۔ سیاہ تکونی ڈاڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ جوتہ پیر میں۔ کھٹولے کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ بیوی سجی ہوئی چائے کی ٹرے میں سے چائے دان لے کر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ لڑکا وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دُودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجھلائی آواز میں کہا۔ "یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رُک گیئں۔ مسکرا کر بولیں۔ "اے مُوا ڈیوڑھی میں آگیا تھا۔ کُوں کُوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آگیا۔ کیسا پیارا ہے میں نے باندھ لیا۔"

میاں نے لاحول کو قرأت سے ادا کر کے کہا۔ "ہگے گا تو.......؟"

"بھنگن اٹھائے گی۔"

"مُوتے گا جو؟"

"تو لوٹے سے دھویا جائے گا۔ آؤ چائے پی لو۔"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ مُنّن کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جاکر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دوسرا قمیص اور پاجامہ پہن کر منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر ڈاڑھی کو پونچھا اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں۔ اب پھر میاں بولے۔ "کیا

نجاست پھیلائی ہے پھکوادو باہر!"

بیوی نے بگڑ کر کہا۔ "بس تم کو تو ایک بات کی دُھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انہی حضرت کا شوق ہو گا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دُودھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گُھس چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پِلّا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گود والی لڑکی کو اُسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں جہاں ایک دفعہ اس کی رسّی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود اُن کے پیروں میں آ گیا۔ آخری یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اس کو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں بیوی کو بھنبوڑتے رہے۔ اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پِلّا صدائے احتجاج بلند کرتا رحیمن بوا (ماما) کے پیچھے گھسٹتا ہوا نخاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا اور سڑک کے سُپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک موٹر نے غیں! غیں! کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا پکّی نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پِلّا عرصے تک ٹیاؤں، ٹیاؤں کرتا رہا۔

—— ""پ"" ——

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے لیکن نالی اس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کے سڑاپوں سے کچھ پانی پیا اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چل دیا۔ آٹھ قدم چل کر پھر اس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسّی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔

دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹھے کا قلم۔ صرف پیر آزاد تھے۔ چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلا کیچڑ میں لت پت ہو گیا اتنے میں قصائیوں کے دو لڑکے اور آ گئے۔ دیر تک وہ اس کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک نے جھک کر اس کی رسی کا سرا پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسی پر لپٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اڑے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کھلے ہوئے ہنستے منہ میں کیچڑ نے اپنا مزا چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں اور بہنوں کے متعلق شستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ کالے پلے نے محبت بھری نگاہوں سے اس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پر پھینک رہا تھا۔ اور اپنے ساتھی کی گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلا دم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلے کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "شیرا ہے شیرا۔" پھر اس نے رسی کے سرے کو پیر سے زمین پر رگڑا اور اٹھا لیا۔ "آؤ شیرا آؤ!" کر کے رسی تانی شیرا نے تین چار پھدکیاں اس کی طرف بھریں اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چلنے لگے تو پیں پیں کر کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تھے گلی کے نکڑ پر مونڈھا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے لونڈوں کو ڈانٹ بتائی "ارے تمہارا ایسا ویسا لونڈوں کیا کرتے ہو۔ چھوڑ دو پلے کو۔" لونڈے پلے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلا تین انچ کی دم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھا۔ وہیں پر چار دو کانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہاری بیٹھی ہوئی لوہے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے ملا۔ دم پیروں کے اندر کوں کوں کرتا گیا۔ کہاری نے کہا۔ "دھو، دھو۔"

ایک تیرہ برس کی دبلی میلی کہار کی لونڈیا نے برابر کی دوکان سے چھلانگ ماری اور پلے کو اٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف

بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھی میں بھور کر بھجڑے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلّوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلّوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے تعشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بری طرح جھڑک دیا تھا تو پھر اس نے بیر بڑھایا۔ اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلّوا کو کھٹیا کے پاس سے اٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلّوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتنی پکڑ لی گئی۔ بھوریا نے اسے بہت دُور بلوچ پورہ کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلّوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار اِنچ اونچا کُرتا پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈھتا ہوا آیا۔ کلّوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلّایا۔ "بابا رے یہ دھرا سالا۔" بابا، قبرستان کے تکیہ دار فقیر۔ مہندی کی قمچی ہاتھ میں لئے آئے اور کلّوا کی بہن کو یاد کر کے بولے۔ "رات بھر چلّایا کیا۔" اور مہندی کی قمچی سے کلّوا کو دُھنکنا شروع کر دیا لمبے کُرتہ والا لڑکا کلّوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جائے۔ یہاں کلّوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا اور پیروں پر قمچی کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے قمچی ٹوٹی تو اس کی جان بچی۔

کلّوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دُور کچھ عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں آئیں لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکیہ نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف

سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ صبر پر جبر نہ ہو سکا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اُس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑ لی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوُں کوُں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہولیا۔ قبرستان کے دوسرے سرے پر دو مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھری اور ایک مقبرہ۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کھٹیاں ایک لائن میں پڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر اُکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بُری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی اُسی کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اُس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عِزت پر غصہ آ گیا۔ اس نے تین چار دفعہ کُھریاں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہرا اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھوُنٹا بکری نے بھی جُگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آکر گری تو اس نے اپنی دُم کو شکریہ کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں پر بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اٹھا لیا۔

چونکہ بوٹی مزے دار تھی۔ دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اڑی۔ ان کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آکر رک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریہ کے دے کر کلوا کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اچھلی تو بکری کے پاس

گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ چابن نگل کر جگالی کے نئے غلّہ کے گردن میں سے چل کر منہ میں آنے کے انتظار میں تھی۔ کوئی بھلا جانور ایسے موقعے پر دخل اندازی پسند نہیں کر سکتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر کھریاں جوڑ حملہ آور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا۔ معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے جواب دیا۔ "ہڈی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو جھوٹے حملے کیے۔ بکری صاحبہ ڈر گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسی کو بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسی تنی جھٹکا سا کھایا۔ دھم سے زمین پر دراز ہو گئیں۔ کلوا کی جانے بلا۔ ہڈی اٹھا دوسری طرف چل دیئے۔ جب رسی تن گئی بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اٹھ کر ایک رسی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گزر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسی پر ورزش دی جائے تو کیا ہرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں۔ ایک بہت اونچی پکی قبر۔ وہی پت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں۔ ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ۔ سب کو دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کیا۔ دوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اُس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اُسے دیکھا اور بھاگا چار چھلانگوں میں یہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دُم پھول کر جھاڑو ہو گئی پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر چھوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک سے دوسرے نے معافی مانگی۔ وہ اُدھر

چلدیا اور یہ ادھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی بُو مل جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا ایک موٹے کتّے نے لیٹے لیٹے غرّا کر کہا۔ "ہوُں" کلوا نے دُم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بُو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سُوں سُوں کر کے فوراً ڈھونڈھ لی۔ دیکھا تو کچھ حصّہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آر، کے ریلوے کی چوکی آ گئی۔ ایک بوچے کتّے نے لپک کر اُن کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دِکھا بُردباری سے کھینچ کر کہا۔ "کھیں"۔ کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا۔ کھیں۔" بوچے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا۔ "دیکھیں۔" کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھٹکوں سے مُنہ بنا کر کہا۔ "ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ ہیں"۔ ایک کُتیا اور آ گئی۔ اس نے آتے ہی کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا، اور پھر بے پرواہی سے انہیں چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے۔ "جانے بھی دو لونڈا ہے۔" مگر بگڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا، ہم ہم ہم، کر کے اوپر چڑھ بیٹھا، ناچار کلوا نے اطاعت قبول کی، چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر۔ کے لائن کے اوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائیداد تھی۔ کلوا نے بار بار چندو کی یاد میں اس جائیداد کو چھوڑ کر دُور کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپّہ چپّہ کتّوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتّوں کے قانون میں سخت جرم ہے۔ اگر کسی بڑی جائداد کے تنہا خونخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک، دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوئے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا اور آدابِ جنگ کی تمام

باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دُور، بوچا استاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ استانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر استانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے اس کا انتظام ہاتھ میں لیا متغینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور چیلوں کے پنجوں سے ٹپکتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی مُنہ رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں استانی چربیا گئیں۔

اور اُن کے ہاتھ پیروں پر رونق آگئی۔ لیکن اب استانی کو اُن کا تعشق لونڈھیا یا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلی جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ جو اور گزرا تو اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ، لہراتی ہوئی لمبی دُم، گٹھا ہوا بھاری تھوتھنا۔ ہاتھ اور پیروں پر اُبھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھائے ہوئے۔ قد میں بھی بڑے سے بڑا کتا اُن کو نہیں پہنچ سکتا تھا چور اور آوارہ گرد کتوں کا اُن کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اُس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بو تھی۔ ...... کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا۔ یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دیئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بُو اُس کے واسطے الگ تھی۔ بُو لیتا بُو ہی بُو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان تک آنے میں اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہو گا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اُس نے بلوچپورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسیوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چُور جس وقت وہاں پہنچا

رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی، مکان وہی تھا۔ دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے، چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بُو بہت خفیف تھی، کتے آتے اس پر بھونک کر چلے جاتے۔ مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چندو کی بُو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بُو گم ہو گئی۔ اس نے دکان کے سامنے منہ اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان اس کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولھا کے ساتھ دولہن بن کر بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لٹیا لئے یہ کہتا ہوا نکلا۔ "روئے جات رے کوکر"

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قدآور۔ لیکن کچے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے۔ جب کہیں جاکر اُن کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصہ یہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذارتا۔ جہاں اب اس کا پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی برابر مار کھاتا رہا۔ لیکن اس نے دوکان کا دامن نہ چھوڑا یہاں کھانے کو کافی اور پھر عمدہ چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ لیکن افسوس دل کی آگ محبت کے چھینٹوں کی طالب سُلگے گئی۔ کچھ عرصے بعد اُس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے اور محبت کے لین دین کا خواستگار ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا۔ مگر آخر چندو آہی گئی۔

بالکل وہی، چندو کچھ دُبلی اور ہو گئی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ لیکن کلوا کو بھول چکی تھی۔ وہ کلوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ لیکن کلوا کتا تھا زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر نہ ملے تو زمین چاٹی۔ کہاری کی جوتیاں جب پڑیں لیٹ گیا آنکھیں بند کر لیں۔ کہار نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ سمٹ کر چلا آیا۔ لیکن سب لاحاصل اس بڑی چکی کے دونوں پاٹوں میں پتھر کم پستے ہیں۔ اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سسرال چلی گئی۔

آج کالا کتا غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ منہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں اور دُم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج ہی وہی پیارا بچہ مُنّن، باپ کی بے جا سختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اُس نے سُونی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ مُنّن عیدگاہ کی چارفٹ اونچی دیوار پر بیٹھا سوچ میں تھا، دن تو گزر گیا، اب کیا کرے۔ گھر جائے نہ جائے، وہاں خبر ضرور ہو گئی ہو گی۔ ننھے سے دل میں وحشت کے پنکھے چل رہے تھے۔ وارفتہ دل، صحرا نورد کلوا کا گذر ادھر سے ہوا۔ اس کی نگاہ بچے پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے اُن میں سہانی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں، آنکھ، ناک، کان اور مُنہ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں۔ لیکن کتوں کے لئے اُن پر خوشی کی چمک، غم کی سیاہی اور محبت کی ارغوانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا کہ بچہ اُداس بیٹھا ہے لیکن وہ اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے جہاں جہاں وہ جا رہا تھا بچّے کی بُو رواں دواں تھی۔ اُس نے اس بُو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اُس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی، نہ رہا گیا، گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا ایک سمندر موجزن تھا جس میں سے لپلپاتے شعلے تابہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کر ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصہ کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں۔ آئیں ادھر آئیں۔ میں اُن کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، جفاکاری میں بھینسا کُتے کا مقابلہ

نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھّر کی سل کتّے کے آگے گھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتّے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبّت کی ایک چھوٹی سی چمکاری میں کتّا پیروں پر گر تا ہے اور اس وقت وہ حلم، عاجزی، انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

مُنّن اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روغنی ٹکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انڈا تھا نہ انڈے کی بُو اس پر بھی ٹکیہ کلوا کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ مُنّن نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منہ کھول کر محبت کے نشے میں دعاؤں، کہہ کر انگڑائی لی۔ مُنّن کھیلتا کھیلتا کتّے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا قدرتاً گھر کی طرف آگیا۔ یہ بھی تو امید تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو ڈرتے ڈرتے گھر میں گھُسا۔ کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے منہ دُھلایا، ناشتہ کھلایا۔ اکنی کنکیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصّے اور مُنّن کے بیچ میں سدِ سکندری بن کے حائل ہوگئی۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی اور منّن سو گیا۔ افسوس اے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی تھاہ نہ لی۔ بچے کے دل میں بچہ بن کر گھسنا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج، مُنّی مُنّی خوشیاں، معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں اور بے وقوف مائیں اس کو دُنیا میں کسمپرس چھوڑ دیتی ہیں۔

———— ..... ————

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہوگیا۔ سیاہ پینتیس سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے متصادم ہوا، ماسٹر زمین پر گر پڑا۔ کلوا اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ روتے ہوئے مُنّن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا

اور نسیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جاکر "آؤ، آؤ" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی مُنّن سے آن ملا۔ سَر اٹھا کر مُنّن کا مُنہ چاٹنا چاہا تو اس نے سَر پر سلیٹ ماری۔ کلوا خوش ہو گئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لئے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لیکر مُنّن نے پھر عیدگاہ کا رُخ کیا کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹر ورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سائے میں دونوں بیٹھے۔ مُنّن نے کوٹ کی جیبوں میں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے۔ ہڈیاں اور بوٹیاں، کلوا کو کھلائیں اس کے بعد املی پر الجھی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا لنگر اُچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اچھال پر اُچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوا فٹ ان کی حد تھی اس کے بعد عیدگاہ میں بسیار ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اٹھا کر تال کٹورے، کا رُخ کیا۔ راستہ میں مُنّن نے کیتھے کے وہ چٹخارے لئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصّہ مِلا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا۔

۵

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

جانوروں کو انسٹنکٹ (instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے مُنّن گھر واپس ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں۔ باپ دروازے پر کھڑے اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ سَر سے پیر تک کانپ گیا اور فوراً واپس لوٹ پڑا۔ پھر عیدگاہ پہنچا، وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی

طرف خود بخود اٹھنے لگے۔ واٹر ورکس کے پاس آکر پھر دل میں پنکھے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹر ورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دُور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کُود کر ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کُود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکّی دیوار تھی۔ جس سے ڈیڑھ فٹ کے نیچے شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ مُنّن اپنی فکریں بھول گئے۔ کنارے اُکڑوں بیٹھ کر مچھلیوں کی سیر میں محو ہو گئے۔ ایک مچھلی دیوار کی جڑ تک آگئی۔ منّن نے جھک کر اُسے پکڑنا چاہا۔ پوری جان سے اندر لڑھک گیا۔ کلوا کچھ دُور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اُس نے پانی میں جست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے۔ بچہ پانی کی تلی کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتادیا کہ بچہ کس جگہ اُبھرے گا۔ وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

اُفق کی سرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑ نے پانی کی سطح پر سراٹا مارا۔ دو بوند پانی مُنہ میں اٹھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک نیولے نے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ راہِ عدم سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہِ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی۔ یا اپنی ناک پانی سے باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت ہی باقی نہ تھی۔ مالک کی ناک اوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑ دی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنبھلتے اُترے۔ چھ ۶ فٹ کے پھیلے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے.........!

بیرو

جوگی کی گرفتاری کے بعد سے بیرو کا مزاج اور بھی زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ قصبہ کے لڑکوں نے اسے لاوارث سمجھ کر چھیڑنا شروع کیا تو وہ آتے جاتے ہر ایک انسان پر حملہ کرنے لگا۔ جانبین سے رنجشیں اس قدر بڑھیں کہ قصبہ کے لوگوں نے اینٹیں پتھر مار کر اُسے جوگی کی منڈیا بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پژمردہ دل بیرو منڈیا کو حسرت سے دیکھتا ہوا، ریلوے لائن کے پار اتر کر جنگل کے کنارے نہر کے پُرانے بھٹے پر چلا گیا۔ جہاں سے اُس نے گاؤں کی بھینسوں کو مار مار کر نکالنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے اُدھر سے راستہ چلنا بند کر دیا۔ کھٹیمہ کی بستی بھر میں اطلاع ہو گئی کہ جوگی کا مرکھنا بیل گائے بھٹہ پر ہے۔ اُدھر کوئی نہ جائے بیرو نے بھی بھٹہ کی تنہائی کو غنیمت سمجھا۔ اس کو انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاؤں کے جانوروں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اور اُس کا جوگی (جس نے کہ اسے پالا تھا) دونوں یکہ و تنہا ایک دوسرے سے محبت کرنے کو پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کا ثانی کوئی نہ تھا۔ نہ جوگی ایسا نیم برہنہ بڑے بڑے بالوں والا کوئی دوسرا انسان تھا، نہ ایسا بھاری قد آور، سیاہ کوٹ، سفید مفلر، خوبصورت چونچ دار ڈاڑھی اور نوکیلے چمکتے سینگ والا دوسرا جانور ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنی تنہائی کا خیال آیا کرتا تھا۔ لیکن جوگی کی صحبت میں دل بہل جاتا تھا۔ جوگی اُسے اپنے اک تارے پر گانے اور بھجن سنایا کرتا تھا۔ نمک ملواں بھیگے ہوئے چنے کھلاتا تھا۔ اس کی گردن کھجاتا تھا۔ اب جوگی بھی دفعتہً جدا ہو گیا

نہ معلوم کہاں گیا۔ جوگی کی جدائی اور اپنی تنہائی سے بیرو افسردہ تھا۔ شروع جاڑے کا موسم، شام ہو رہی تھی۔ بھٹے پر ایک گڑھے کے کنارے جہاں اس نے اپنی بیٹھک بنالی تھی۔ بیرو کھڑا ہوا کبھی پانی میں اپنے عکس کو دیکھتا تھا اور کبھی سر اٹھا کر ریلوے لائن کے پار شام کے دھوئیں سے دھندلی کھٹیمہ کی بستی اور اسٹیشن کو دیکھتا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف سے سُریلے گھنٹے بجاتے ہوئے گائیں اور بھینسوں کے ریوڑ گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ آسمان پر ایک دوسرے کو آواز دیتے ہوئے طوطوں اور کوّوں کے جھنڈ بسیرا لینے جنگل کی جانب اُڑ رہے تھے۔ اور یہ پانی میں اپنے شاندار عکس کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ اس کو افسوس تھا کہ یہ دنیا میں اکیلا ہی پیدا ہوا ہے۔

اسی رنج میں بیرو اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی پشت پر جنگل تھا۔ جہاں بالکل خاموشی تھی۔ بہت دور سامنے سے کھٹیمہ کی بستی سے ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس کو اپنی پشت پر ہلکی سی آہٹ معلوم ہوئی۔ اب جو گھوم کر دیکھتا ہے تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بالکل اُسی کا ہم شکل ایک نیل گائے جنگل سے دو گز باہر کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ ویسا ہی سفید سینہ، سیاہ پیٹھ، ویسی ہی داڑھی، قد بھی قریب قریب اسی کے برابر تھا۔ لیکن گلے میں کوڑیوں کا کنٹھا اور بانسے پر پتلی رسی کی ناتھ نہیں تھی اور جسم بھی اسی کی طرح بھاری نہ تھا۔ بلکہ سیاہ چھریرے گول چمکتے ہوئے ہاتھ پیر بڑے ہی خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر بیرو کے دل میں ایک عجیب گدگدی سی پیدا ہوئی۔ یہ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اس نووارد کی طرف بڑھا۔ نیا نیل گائے بھی پھُرتی سے دُم کی تھاپی کو دائیں بائیں ہلاتا ہوا ایک ایک قدم اُس کی طرف آیا۔ جب بیرو اس کے قریب پہنچا تو اُس کے دل میں اس ہم جنس سے سینگ لڑانے کی خواہش از خود پیدا ہونے لگی۔ اس کا مدِ مقابل بھی اپنے سینگوں کی نوکیں سامنے کئے اور سر کو جھٹکا دیتے ہوئے برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن جب ان دونوں میں چار چھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تو جنگل کے نیل گائے کی نظر اُس کے کنٹھے پر پڑی

وہ فوراً ہی گھوم پڑا اور نوک دُم بھاگا۔ جنگل میں گھسا اور غائب ہو گیا۔ بیرو پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا؟ یہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل تک گیا اور دیر تک تاریک جنگل کو دیکھتا رہا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ جنگل میں گھُس کر اپنے ہم جنس کو ڈھونڈے لیکن وہاں بالکل اندھیرا تھا اور اندھیرے میں چلنے پھرنے کا یہ عادی نہ تھا۔ مجبوراً پھر بھٹے پر واپس آیا۔ ایک اونچی سی جگہ اطمینان سے بیٹھا اور سوچ سوچ کر جگالی کرنے لگا۔ وہ بار بار جنگل کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید اس کا ہم جنس پھر آجائے۔

دوسرے دن صبح بہت سویرے بیرو جنگل میں گھُس کر اپنے ہم جنس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ یہ بہت دُور تک سال بنی میں چلا گیا۔ جہاں کہ اونچے قد آور درختوں کے نیچے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں نہ تھیں۔ لیکن اب یہ جُوں جُوں آگے بڑھتا تھا سال کے درخت چھوٹے اور جنگل گھنا ہوتا جاتا تھا۔ اس سے گھنے جنگل میں چلنے میں بہت دقت ہوئی۔ یہ کھُلی ہوئی صاف زمین کا عادی تھا۔ بیلوں اور جھاڑیوں میں اس کے پیر الجھتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اسے اس طرح پھرنے میں لطف آنے لگا۔ اس کو چلتے چلتے دوپہر ہو گئی لیکن سوائے چند مُوروں کے اور کوئی جانور یہاں نظر نہ آیا۔ یہ جو جو آگے بڑھتا تھا جنگل گھنا اور دشوار ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پریشان ہو کر لوٹ پڑا۔ جب یہ جنگل سے باہر نکلا۔ دن چھپ رہا تھا۔ جنگل کے کنارے کانٹوں کی باڑھ سے گھرے ہوئے گیہوں میں یہ گھس گیا۔ ہرے ہرے گیہوں میں یہ چرتا ہوا ایک دفعہ پھر کھیتمہ کی طرف چلا کہ شاید جوگی آگیا ہو۔ راستہ میں کئی آدمیوں نے اس پر ڈھیلے برسائے اور اُس نے ان پر حملے کئے۔ جب یہ منڈیا کے پاس پہنچا تو لوگوں نے باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کی۔ جوگی کے ملنے کے بجائے کئی پتھروں کی چوٹیں اسے ملیں۔ ناچار بھٹے پر آگیا۔ اب نہ بھٹے پر اس کا دل لگتا تھا نہ بستی میں گذر! جنگل ہی کی طرف دھیان تھا۔ مگر وہاں بھی گیا تھا۔ بیرو بے حد بدمزاجی اور مردہ دلی سے رہنے لگا۔ روزانہ شام کو اس جگہ کی طرف

دیکھتا رہتا تھا جہاں کہ ایک دفعہ اس نے اپنے ہمشکل کو دیکھا تھا۔

ایک دن سویرے بیرو بھٹے سے کچھ دُور جنگل کے کنارے کنارے جا رہا تھا لاکھوں زبردست درختوں کے تنے اوُپر کی سبز چھت کے اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے۔ ان ہی میں کچھ کھس کھس ہوئی اور رُک گئی۔ بیرو نے رُک کر بڑے غور سے ان بیشمار ستونوں میں دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ یہ پھر چلنے کو تھا، ایک دفعہ کئی جانوروں نے ایک ہی ساتھ جنبش جو کی تو اب صاف نظر آگئے ان میں سے ایک اس کا ہمشکل سیاہ نر نیل گائے تھا اور چار چھریرے بدن کی خوبصورت نازک اندام گائیں تھیں۔ جن کو دیکھ کر بیرو کے دل پر بجلی سی کوندی۔ اس کی ہم جنس ماداؤں کا چھوٹا سا گلہ۔ کاش اس دوسرے نر کے بجائے بیرو خود اُن کے ساتھ ہوتا۔ آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دُنیا میں وہ تنہا جوگی کی صحبت کے واسطے پیدا نہ ہوا تھا۔ اُس کے دل میں ایک جولانی پیدا ہوئی پست خیال امیدوں میں رنج مسرت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ فوراً ان کی طرف دُلکی کی چال میں روانہ ہوا۔ کھیت اور جنگل کے درمیان کانٹوں کی باڑھ کو بغیر دیکھے بھالے، چیرتا کچلتا ہوا نکلا چلا گیا۔ ادھر ماداؤں نے ایک ایک دو دو قلانچیں بھر کر کچھ پیش قدمی کی۔ لیکن پھر سب کی سب ادھر ہی مُنہ کر کے ساکت کھڑی ہو گیئں۔ گلہ کا مالک جنگلی نیل گائے اپنے حرم کی حفاظت کے واسطے سینگ جوڑ کر ماداؤں کے آگے کھڑا ہو گیا بیرو کو بھی قدرت نے یا۔ رگوں میں دوڑنے والے خون نے آگاہ کر دیا کہ دو نروں کے درمیان فاتح گلہ کا مالک ہوتا ہے اور شکست خوردہ اس وقت تک تنہا پھرتا ہے۔ جب تک کہ وہ طاقت ور بن کر پھر نہ فتح حاصل کرلے۔ یا کسی دوسرے کمزور نر کو شکست دے کر اس کی خوبصورت ملکاؤں پر قبضہ حاصل نہ کرلے۔ بیرو کو اپنی طاقت پر ہی ناز نہ تھا۔ وہ گلہ کو حاصل کرنے کے واسطے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت اُس کے سامنے ہاتھی بھی ہوتا تو وہ اس سے بھی پانی بھرتا اور اپنے خون کی آخری بوند بہائے بغیر پسپائی قبول نہ کرتا۔

لیکن افسوس جیسے ہی وہ اپنے مدِمقابل کے قریب پہنچا ماداؤں کی نظر اس

کے گلے کے کنٹھے پر پڑی۔ وہ ڈر گئیں۔ "پی قوں، پی قوں" چلّا کر وہ بھاگ پڑیں اُن کے نر کو بھی ٹھہرنے کی اب کوئی ضرورت نہ رہی۔ جب مستورات ہی اجنبی کو ناپسند کرتی ہیں۔ تو پھر کیسی لڑائی۔ وہ بھی گلہ کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ پہلے تو بیرو حیران و ششدر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر وہ بھی اُن کے تعاقب میں دوڑا۔

بھاری جسم دوڑنے کا عادی نہیں ہجنگل گھنا رہ گیا۔ اُن کی خاک بھی نہ پا سکا، البتہ اُن کی بُو ملی۔ اُسی کے سہارے چلتا رہا۔ اس کے واسطے آج یہ بالکل ہی نئی بات تھی۔ بُوئیں طرح طرح کی اُس کو ہزاروں روز معلوم ہوا کرتی تھیں لیکن اُن پر کبھی اُس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ آج اُس کو معلوم ہو گیا کہ اُن کی بھی کتنی اہمیت ہے۔ ماداؤں کی بوؤں میں عجیب مستی تھی۔ اُن کے تعاقب میں مسرت تھی۔ یہ اسی طرح بہت دُور چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک جلے ہوئے چاندر کے میدان میں نکل آیا۔ یہاں ہوا تیز چل رہی تھی۔ بُو بھی منتشر ہو گئی۔ لاچار کھڑا ہو گیا۔ میدان میں کوئی جانور نہ تھا۔ جنگل کے کنارے کنارے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں چھ مادین چیتلیں نظر آئیں بہت کچھ نیل گایوں سے مشابہ تھیں۔ مگر کہاں نیل گائیں۔ کہاں یہ چیتلیں۔ جونہی بیرو قریب پہنچا یہ بھی اُس سے ڈر کر بھاگیں۔

آج تک بیرو اپنی دُنیا، اپنے ہم پائے، اپنے ہم جنس حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بے خبر، انسانوں کی مصنوعی دنیا میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ جہاں کہ اس کی ہستی ایک ناگوار مہمان سے زیادہ نہ تھی، نہ یہ دُنیا ہی اُسے اپنی سرگرمیوں میں شامل کر سکتی تھی۔ نہ بیرو خود اس دُنیا کی زندگی میں کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ زندگی کی جد و جہد۔ یعنی جنگ بقائے حیات، جس میں کہ رات دن ہر نفس مبتلا ہے۔ یہی زندگی کی دلچسپیاں ہیں۔ یہی چشمہ ہائے آبِ حیات۔ بیرو ان سے بے سروکار، از خود آجانے والی غذا سے شکم پُر۔ غموں اور مسرتوں سے بے بہرہ۔ حسرتوں اور امیدوں سے نا آشنا۔ جستجو اور تعاقب، نفرت اور محبت۔ غرض یہ کہ تمام جذبات سے ناواقف نیم خوابیدہ حالات

میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ عقل و حواس گم کردہ ایک بے کیف نشہ اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ زندگی اُس کے لئے مشغلہ نہ تھی۔ مشغلے اُس کے واسطے بے کار تھے۔ لیکن اب دفعتہً اس کے آگے زندگی، اصلی پُر لطف زندگی کا ایک میدان وا ہو گیا تھا۔ اس کو اپنی اصلی دُنیا صاف اور کشادہ سامنے نظر آرہی تھی۔ وہ دنیا جس کے واسطے یہ پیدا ہوا تھا۔ اور جہاں کا پتہ پتہ اُس کے واسطے لامحدود مسرتیں لئے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اُس کے سلب شدہ حواسؔ[1] تیزی سے بیدار ہونے لگے۔ کان خفیف آوازوں پر گھومنے۔ ناک میلوں کی بُو پر تھرتھرانے لگی۔ پنڈلیاں سامنے کی رکاوٹیں از خود دیکھ کر راستہ ڈھونڈھنے لگیں۔ آنکھیں رات کی تاریکی چیرنے لگیں۔ ایک ہی ماہ میں بیرو پکا جنگلی نیل گائے ہو گیا ہے۔ مگر افسوس غلامی کا کنٹھا کوڑیوں کی مالا اب بھی اس کے گلے میں ہے۔ البتہ سڑی ہوئی ناتھ ایک ڈالی میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن اس کنٹھے نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ جس طرح کہ کھٹیمہ کی بستی سینگوں کی وجہ سے اس سے بھاگتی ہے، اب اُسی طرح جنگل کی بستی کنٹھے کی وجہ سے اُس سے بھاگتی ہے۔ نئے اُگتے ہوئے چاندریں چیتل، سانبھر، پاڑے اور نیل گائے راتوں کو خاموش پہلو بہ پہلو چرتے ہوئے دیکھتا لیکن جب یہ اُن کے پاس جاتا ہے تو سب ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر ٹہل جاتے ہیں۔ دن کی تیز دھوپ میں پتاوروں، بے جلے چاندروں، گھنے کھیروں اور کلکوں کے تختوں میں یہ مارا مارا پھرتا ہے۔ ان میں جا بجا اطمینان سے بیٹھے جگالی کرتے جانور اسے ملتے ہیں۔ لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی دُمیں ہلاتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سر جھکا جھکا کر گھنی گھاس کی پتلی گلیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بیرو اس سرگردانی اور پریشانی میں جنگل کے کئی رینج (RANGE) پار کر چکا ہے۔ کھکرا، لوہیا، سونی، گرکھا، جلپورا،

---

[1] خواہ پانچ ہی مان لئے جائیں۔ مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جنگلی جانوروں میں دس سے زیادہ حواس ہوتے ہیں۔

بگھاند یا پار کر کے منڈی کے شمال مغرب میں نیپال کی سرحد پر چاندنی کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا ہے۔

چاندنی کی پہاڑیاں فلک بوس ہمالیہ کی پہلی سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ ہے۔ نہ پہاڑوں کی سردی ہے، نہ چیڑ کے درخت ہیں۔ وہی سال کا جنگل، جنوب کی ترائی سے پھیلتا ہوا ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلند چوٹیوں تک چڑھتا چلا آیا ہے البتہ یہاں آکر یہ ختم ہو جاتا ہے شمال کے اُتار پر جو بے انتہا ڈھلوان ہے۔ بڑے بڑے پتھروں اور پھیلی ہوئی چٹانوں میں پہاڑی، سدا بہار گھنی جھاڑیاں، پہلے تو خال خال نظر آتی ہیں۔ لیکن جو جو وادی میں اُترو یہ بتدریج بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس قدر گھنی ہو جاتی ہیں کہ چاندنی اور نیپال کے گورا پہاڑ کی تنگ گھاٹی میں کالی ندی کو دونوں طرف سے گھیر کر چھپا لیتی ہیں۔

یہاں سبزے کی آرائش میں قدرت نے اپنی تمام فیاضیاں ختم کر دی ہیں، پتھروں پر کائی کی طرح سبزہ اُگتا ہے۔ اس سبزے کی ہر پتی کرشمۂ قدرت کا ایک نمونہ نظر آتی ہے۔ کوئی مخملی ہے۔ چاندنی کی طرح چمکتی ہے۔ کوئی چکنی ہے، ریشم کی طرح نرم اور نازک ہے۔ کسی پر سُرخ ٹھپے ہیں کسی میں سفید دھاریاں ہیں، کوئی انتہائی تراش اور کٹاؤ کی پتی ہے۔ لیکن ہیں سب ہری۔ ہر جگہ ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔ نیچے سبزے کا فرش اوپر جھاڑیاں، جھاڑیوں پر بیلیں۔ ہر جگہ طرح طرح کے پھول، ہر جگہ طرح طرح کی خوشبوئیں۔ جگہ جگہ مقطر پانی کے شفاف بہت چھوٹے چھوٹے چشمے۔ گنگناتے، دھیمے دھیمے راگ گاتے، پتھروں کو کتراتے، چٹانوں پر جھلجھلاتے، دونوں طرف کی ڈھالوں پر سے بڑی بڑی جھاڑیوں کے سائے میں گھومتے گھامتے نیچے اترتے چلے آتے ہیں اور کالی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کالی متواتر چھوٹے چھوٹے آبشاروں پر جھر جھراتی، بڑے بڑے پتھروں کو کتراتی نکلتی ہوئی چٹانوں کی گھوم پر سنسناتی اس باغ کے بیچوں بیچ میں لہراتی ہے۔

دراصل یہ چھوٹی سی وادی باغِ اِرم کا ایک نمونہ ہے۔ جسے سر بفلک 'گورا' ایک طرف سے اور ناقابلِ گزر سیدھا کگار لیے ہوئے چاندنی کا سلسلہ دوسری طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اسی قلعہ کے جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں یا بید کی ٹھنڈی بیلوں کے اندھیرے

سائے میں جنگل کا بادشاہ، گیارہ فٹ سیاہ دھاریوں والا سنہرا شیر دن بھر غفلت کی نیند سوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب چڑیاں چہچہانا بند کر کے ڈالیوں میں ڈبک ڈبک کر بسیرا لینے لگتی ہیں اور لاکھوں جگنو چمک چمک کر کالی کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں تو پھر انگڑائیاں لیتا ہوا اور عاؤں عاؤں کرتا ہوا بادشاہ ٹہلتا ہوا ندی کے کنارے آتا ہے۔ دو چار کانکڑ[1] جو یہاں رہتے ہیں۔ بھونک بھونک کر گورا کی چڑھائیوں پر چڑھ جاتے ہیں یہاں چوپائے بالکل کم ہیں۔ کیونکہ باوجود درختوں، پودوں اور گھاسوں کی کثرت کے کھانے کے قابل کوئی سبزہ یہاں نہیں ہے۔ غذا ترائی کے جنگل ہی جنگل میں کثرت سے ہے۔ اس لئے سانبھر، نیل گائے، چیتل اور پاڑے چاندنی کے دامن ہی میں رہتے ہیں۔

البتہ جب کبھی دو ٹانگوں والے جانور۔ آگ اگلنے اور گرجنے والی لکڑیاں لے کر آجاتے ہیں تو پھر یہ جانور ان ظالموں کے خوف سے چاندنی کی چوٹیوں پر چڑھ کر خطرناک اور دشوار راستوں سے دوسری طرف نیچے اُتر کر کالی کے گوشۂ عافیت میں پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہاں ان کو شیر کے پہلو بہ پہلو رہنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی ان کو یہ گوارا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ اس جنگل میں ٹھہریں جہاں کہ ظالم اور بے رحم انسان آگیا ہو۔ شیر باوجود درندہ ہونے کے جنگل کا رہنے والا ان کا ہمسایہ ہے۔ جس کی موجودگی ان کو چارو ناچار گوارا کرنی پڑتی ہے۔ وہ جنگل کا بادشاہ ہے جس کو کہ ہر ہفتے اُن کے گلہ میں سے کسی ایک گلہ کو جان کا خراج دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہے۔ وہ بلا ضرورت محض جان لینے اور خون بہانے کے واسطے کبھی شکار نہیں کرتا۔ جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ اُن کے سامنے تک نہیں آتا اور اگر سامنا بھی ہو جائے تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔ اس کو چوپاؤں کو بلا وجہ ڈرانے کی عادت نہیں جب بھوکا ہوتا ہے تو مجبوراً کسی ایک گلہ کو تاک کر اُس کے سب سے کمزور ایک نفر کو اس خوبصورتی اور چالاکی سے دبا بیٹھتا

---

[1] کانکڑ ایک چھوٹا ہرن ہوتا ہے لیکن کتے سے بہت ملتا ہے۔ بادامی کھال کتے کی سی ہوتی ہے دانت بھی کتے کے سے ہوتے ہیں۔ یہ بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتا بھونک رہا ہے۔

ہے کہ اکثر گلہ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ شکار مار لینے کے بعد اگر جانور بڑا ہے تو باسی اور تباسی تک کھاتا ہے۔ یہاں تک کہ شکم سیر ہو کر کسی اندھیرے اور ٹھنڈے مقام پر جا لیٹتا ہے۔ جہاں سے وہ چار دن تک سوائے پیاس بجھانے کی ضرورت کے نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ ساتویں یا آٹھویں دن ایک دفعہ پھر بھوک اسس کو پریشان کرتی ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں گھنی جھاڑیوں میں چھپتا، درختوں کی آڑ لیتا دبے پاؤں نکلتا ہے۔ جنگل کو کھلبلا دینا اور جانوروں پر ہیبت طاری کر دینا اس کا کام نہیں۔ یہ گلوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور ان میں سے بالکل اسی طرح خوراک حاصل کرتا ہے۔ جیسے کہ ایک دُور اندیش مالی اپنے کھیتوں میں سے ترکاری بتدریج نکالتا ہے۔ گوشت کو برباد اور ضائع کرنے سے اسے نفرت ہے۔ ہر جانور اس کی کھیتی ہے۔ جس کے بیجوں سے اس کے گلّے قائم ہیں جب کوئی جانور بڈھا یا کمزور ہو کر نسل کا سلسلہ آگے بڑھانے کے ناقابل ہو جاتا ہے تو پھر جنگل کا بادشاہ اس پکّے اور ٹپک جانے والے پھل کو چپکے سے توڑ کر کھا لیتا ہے گلّے اس سے ڈرتے ضرور ہیں لیکن اس کی ہیبت ان کے دلوں پر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب اُن کے لئے ایک کبڈی ہے جس میں کہ وہ پوری دلچسپی سے حصّہ لیتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی ایک کو شیر کی چُستی اور چالاکی سے شکست ماننا بھی پڑتی ہے تو ان کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس بدنصیب ساتھی پر کیا گزری اور دراصل گزرتی بھی کیا ہے۔ شیر کا بھاری جسم ایک ہی جست میں اس کی کمر پر گرتا ہے جس سے فوراً کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سکنڈ میں دو سخت جھٹکے گردن کی گُرِیّاں الگ کر دیتے ہیں دو منٹ نہیں لگتے کہ جانور کی تمام تکلیفیں دُور ہو جاتی ہیں برخلاف اس کے جس وقت انسان قتل اور غارت کے جذبے سے بھرا ہوا جنگل میں گھُس جاتا ہے تو یہاں کی دنیا ہی خوف و ہراس سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ وہ بلا ضرورت اور بلا امتیاز جانیں لیتا ہے اور صرف غارت گری کے لئے۔ ظلم پر ظلم یہ ہے کہ جتنے جانور وہ ہلاک کرتا ہے۔ اُن سے زیادہ زخمی خون میں نہائے جنگل میں مارے مارے پھرنے۔ دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں

میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔

کبھی کبھی چاندنی کے ان جانوروں کو بھی وحشی انسان کی اس غارت گری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ٹنک پور منڈی اور ان پہاڑیوں کے درمیان کئی خطرناک دلدلیں اور نہایت گھنے جنگل ہیں۔ جنہوں نے چاندنی کی پہاڑیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ عرصہ سے یہاں جانور بے خوف وخطر پُر امن زندگی بسر کر رہے تھے کہ یکایک ہلکی سی ایک بے چینی اُن کی دُنیا میں پیدا ہوئی۔ یعنی بیرو دفعتہً نمودار ہوئے اور مجنوں کی طرح یہاں کی نیل گایوں کی ڈار کے پیچھے پھرنے لگے۔ نہ اس ڈار کو ہی ایک جگہ قرار تھا اور نہ یہ دوسرے ہی جانوروں کو اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے دیتا تھا۔ ان کے نَر نے پہلے تو دلیرانہ مقابلہ کر کے بیرو کو بھگا دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب دیو ہیکل حریف کے مقابلہ میں متواتر شکستیں اٹھا کر کئی زخم کھا چکا تو پھر مقابلہ کرنا چھوڑ دیا۔ بس اتنا ہی کرتا تھا کہ بیرو کو دُور سے دیکھتے ہی مقابلہ کی تمام تیاریاں کر کے سینگ نیچے کھُریاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دشمن قریب آیا تو پھر بھاگ پڑا۔ اس عرصے میں مادائیں کافی دُور نکل جاتی تھیں۔ چھریرے بدن کا جنگلی نیلا چار چھلانگوں میں پھر اُن سے جا ملتا تھا اور بھاری بھر کم بیرو اپنی سُست رفتار میں پھر اُن کا تعاقب شروع کر دیتے تھے۔

چاندنی کی پہاڑی ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ ایک مصیبت اور نازل ہوئی۔ ایک قد آور چڑچڑا اور بدمزاج سفید ریچھ اپنی زخمی مادین کے ساتھ گورا پار کی آٹھ ہزار فٹ کی اونچی برف کی چوٹیوں سے اُترا۔ گورا پار کر کے کالی کے کنارے آ گیا۔ جہاں سے آگے بڑھنے کی سکت اس کی مادین میں نہ رہی۔ کسی شکاری کی گولی سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جس کی وجہ سے وہ کچھ نہ کھا سکتی تھی۔ کالی کے کنارے پانی پی پی کر بھوک اور زخم کی تکلیف میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے آخری دن پورے کرنے لگی۔ اس عرصہ میں سفید ریچھ نے جو کہ قدرتاً بدمزاج ہوتا ہے اور اب اور بھی زیادہ خطرناک

کے پٹھے تانے پینگ سا لیا اور وہ کالی کے پار تھا اس کے لئے بارہ فٹ کا فاصلہ ہی کیا تھا ویسے ہی نکل گیا۔ یہاں سے پھر اُسی لمبی دبی ہوئی دُبکی میں چند سکنڈ نہ لگے تھے کہ تین سو فٹ اوپر گورا کی چڑھائی کی ایک نکلی ہوئی نوک پر پہنچ گیا اور یہاں چند پتھروں کی آڑ میں دبک کر چاندنی کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ جس جگہ کہ اب شیر بیٹھا ہوا تھا، یہاں سے کالی کے دونوں طرف کے جنگل، سامنے کی چڑھائیاں اور چاندنی کا کگارا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ شیر دُم کو اپنے پہلو میں سمیٹے مُنہ کھولے ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا تیزی سے آنکھیں اِدھر اُدھر گُھماتا ہوا سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً ریچھ جس کی کہ بُو اُسے ندی کے کنارے ہی آگئی تھی سامنے پتھروں پر آہستہ آہستہ بھدے پن سے چڑھتا نظر آ رہا تھا۔ شیر کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا۔ دُم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دُم کی پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی۔ شیر بار بار دُبکا ہوا پنجوں کے بل سُدھر سُدھر کر بیٹھنے لگا۔ وہ یہ انتظار کر رہا تھا کہ ریچھ کگارے پر پہنچ جائے اور وہ دیکھ لے کہ کس راستے سے ریچھ اوپر گیا ہے۔ ریچھ آہستہ آہستہ ایک ایک جڑ اور ڈالی پکڑتا ہوا آخر اوپر پہنچ گیا۔ اور زبردست آنولے کے درخت نیچے جہاں کہ زمین کافی ہموار تھی نظروں سے غائب ہو گیا تو پھر جنگل کے بادشاہ نے جنبش کی۔ اب جو چلا تو معلوم ہوا کہ دراصل شیر ہے۔ جس طرح بجلی کوندتی ہے۔ چار جستوں میں یہاں سے نیچے تھا ندی کے آٹھ فٹ اُدھر ہی سے ایک چھلانگ ماری اور تیس فٹ ہوا میں اُڑتا ہوا پار کی گھنی جھاڑیوں کے اندھیرے میں غائب ہو کر دو منٹ بعد پانچسو فٹ اوپر کھڑی چٹانوں اور پتھروں میں ناگن کی طرح لہراتا ہوا نظر آیا۔ یہ اس طرف نہیں جا رہا تھا جہاں کہ ریچھ گیا تھا بلکہ آنولے کے درخت سے کافی مغرب کی طرف ہٹا ہوا ایک ایسے کھڑے کگارے کی طرف جا رہا تھا کہ جہاں پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ شیر اس چڑھائی کو اس طرح چڑھ رہا تھا کہ آنکھ کام نہ کرتی تھی۔ ابھی ایک پتھر پر ہے اور پھر جو دیکھا تو اُس سے بہت اوپر کسی دوسری چٹان کے سہارے جا رہا ہے چڑھتے چڑھتے یہ ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں نہ صرف پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا تھا بلکہ بیس فٹ اوپر ایک

ہو گیا تھا۔ بلا امتیاز چھوٹا یا بڑا جنگل کے تمام جانوروں کو زندگی دوبھر کر دی۔ ریچھ کے جو بھی سامنے پڑ گیا۔ بھاؤں، بھاؤں کر کے اُسے بھنبوڑ ڈالا۔ پنجے مار مار کر حیثیت بگاڑ دی ندی پر جا بیٹھا تو پانی پینے کے گھاٹ بند کر دیئے۔ چاندر میں گھس گیا تو چوپاؤں کی دن کی نیند اور جگالی حرام کر دی۔ ایک ہل چل سی مچا دی اور جب آٹھویں دن اُس کی زخمی ریچھنی مر گئی تو اس کا جنون اور بھی بڑھ گیا۔ جانوروں نے چراگاہیں چھوڑ دیں۔ بندھے ہوئے گھاٹ بدل گئے۔ اُن کی بیٹھکیں اُجڑ گئیں۔ اس ہلچل سے شیر بھی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ شکار بھڑکا ہوا تھا بہت سخت دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ بندھے ہوئے راستوں اور گھاٹوں پر پڑے پتھروں یا سال کے موٹے دو شاخوں کی آڑ میں یہ گھنٹوں بیٹھ کر انتظار کرتا لیکن کوئی ڈار ادھر سے نہ گزرتی۔

آج بھی وہ سخت غصے اور پریشانی میں تھا۔ بھوک کی آگ پیٹ میں لگے دو راتیں ہو چکی تھیں۔ تیسری رات نمودار ہو رہی تھی کہ بھوک سے بیتاب شیر پوستین جھٹکتا، شانے اور پیر زبان سے صاف کرتا گھنے گلاب کی اندھیری جھاڑی میں سے نکل کر کائی کی طرف جھاڑیوں جھاڑیوں روانہ ہوا۔ ایک گستاخ خرگوش نے کچھ دور اس کے پیچھے خریش کی اور پھر غائب ہو گیا۔ ندی کے کنارے جونہی اُس نے پانی پینا شروع کیا۔ ایک مور نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ چلایا اور اس کے چلانے سے گرد و نواح کے دس بارہ مور اور چلائے۔ جنگل میں پھر سکوت چھا گیا۔ شیر نے پانی پی کر پانی کو کچھ بغور دیکھا۔ پھر مڑ کر چار قدم چلا اور رُک گیا۔ بڑی دیر تک دُم کو آہستہ آہستہ جنبش دیتا اور کانوں کے کٹورے گھماتا خاموش کھڑا رہا۔

آٹھویں تاریخ کی ہلکی سی چاندنی پتوں میں سے چھن چھن کر کہیں کہیں اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ سوائے آبشاروں کی مدھم میٹھی رم جھم رم جھم کے باقی تمام سکوت ہی سکوت تھا۔ خوبصورت، لوچیلا، نازک، معصوم، شیر نے دفعتہً ایک جھرجھری لی۔ وہ کچھ معلوم کر رہا تھا اب اس کا مطلب حل ہو گیا تھا وہ پھرتی سے پھر مڑا۔ لمبی ڈُلکی کے دو قدم میں کالی تک آیا۔ اس کے جسم نے بغیر جھکولا لئے یا ہاتھ پیروں

چٹان چھجے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ رُک گیا اور اس کے چاروں ہاتھ پیر سمٹے پیٹ اور سینہ زمین سے چھو گیا اور پھر نگاہ کو مات کر دینے والی تیز چھلانگ میں وہ اوپر کی چٹان پر تھا لیکن اس چٹان سے اوپر اب کوئی باہر نکلی ہوئی چٹان یا پتھر نہ تھا بلکہ خالص ایک ہزار فٹ کی سیدھی کھڑی دیوار کے اوپر دُور بہت زبردست پتھروں کے درمیان سے نکلی ہوئی ایک چٹان اس چڑھائی کا آخری زینہ تھی۔ چنانچہ شیر نے اب ایک پتلی اور نہایت خطرناک پگڈنڈی پکڑلی جو کہ بہت گھماؤ کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی آخر پھر اسی ایک ہزار فٹ اوپر کی نکلی ہوئی چٹان پر آملی تھی۔

......

جنونِ عشق جب سر پر سوار ہوتا ہے تو انسان ہو یا حیوان، تکلیفوں اور تھکاوٹوں سے بے حس ہو کر دنیا بھر کی صعوبتوں اور سختیوں کا سامنا دیوانہ وار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ صحرائے نجد کی وسعتیں شرما جاتی ہیں۔ دامانِ کوہ پھٹ کر جوئے شیر رواں ہو جاتے ہیں۔ تاج و تخت کے ہیرے جھونپڑوں کے چراغوں کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ صدائے عشق کے آگے لن ترانیاں بھی خاموش ہو جاتی ہیں اور چونکہ عشق محض ایک حیوانی جذبہ ہے۔ (جیسا کہ ہر پینتالیس سے اوپر کی عمر کا انسان جان چکا ہے خواہ وہ اس کا قائل ہو یا نہ ہو) اس لئے بیرو پر اس کا اثر اسی حد تک اور زیادہ تھا چلبلی ... اداؤں کی وہ ادائیں، اُن کی میٹھی میٹھی وہ صدائیں، مشک و عنبر سے بہتر اُن کی وہ مست ... بیں سرِ شوریدہ ... یں طوفان بہ سر طوفان برپا کر رہی تھیں۔ جنگلی نیل گائے دن رات ... تعاقب، دن رات کی دوڑ دھوپ سے پریشان، بھوک اور پیاس سے ہلکان، زخموں سے چور دن بدن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن سرِ شام جبکہ دن کی تیز روشنی ختم ہو کر ہر طرف رات کا سہانا اندھیرا چھا چکا تھا جبکہ بارہ ماسی اوس اونچے درختوں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھی اور جبکہ دو بن رکھی چڑیاں ایک دوسرے سے دو میل کے فاصلہ پر سے "تو تراتو تو تو" کے جواب سوال میں متواتر بحث کر رہی تھیں۔ جنگلی نیل گائے بیرو کے مقابلہ سے آخری دفعہ بھاگا۔ اس نے مکمل شکست قبول کر لی۔ اس

دائمی تعاقب سے اپنی جان چھڑانے کے لئے وہ ماداؤں سے دستبردار ہو کر ڈار سے دوسری طرف بھاگا بے نر کی ڈار لاوارث بنی ہوئی چاندنی کی ڈھال پر بیرو سے ڈیڑھ سو فٹ اوپر کھڑی تھی۔ بیرو اس طرف روانہ ہوا۔ مگر مادینیں حسبِ دستور اس سے ڈر کر بھاگ پڑیں بیرو کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ وہ پھر اس نر کا تعاقب کرے۔ اس کو شکست فاش دے بلکہ ہلاک کر ڈالے۔ ادھر جنگلی نیل گائے نے ان سب جھگڑوں کو چھوڑ کر چاندنی کے کگارے کا رُخ کیا۔ جہاں سے وہ اوپر ہی اوپر جا کر مشرق کی طرف سے کھیر کے گھنے میں اُتر جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی وہ ان دو بڑے پتھروں کے پاس پہنچا جن کی آڑ میں ایک بڑی چٹان چھجے کی طرح ایک ہزار فٹ کی بلندی پر نکلی ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت شیر بھی وہاں آچکا تھا۔ شیر آیا تو تھا۔ ریچھ کو سزا دینے لیکن اُسے خوراک کی بھی سخت ضرورت تھی۔ بھوک سے بے تاب تھا۔ چھ گز کے فاصلہ پر بڈھا زخمی نیل گائے جا رہا تھا۔ دونوں بارہ چودہ فٹ کے موٹے پتھروں کے بیچ میں تین فٹ کی گلی سی تھی۔ اس میں سے وہ جھپٹا اور نیلے کو گرا لیا۔ دو چار جھٹکوں میں شکار بے حرکت ہو گیا۔ عادت کے موافق شیر کو فکر ہوئی کہ کسی پوشیدہ تنہائی کی جگہ پر گھسیٹ لے جائے اور پھر کھانا شروع کرے۔ لیکن پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پشت پر کی چٹان بھی کافی تنہائی کی جگہ تھی۔ یا کم از کم ناشتہ کر لینے کے واسطے کچھ دیر کے لئے شکار وہاں بھی کھایا جا سکتا تھا گردن پر سے جہاں اُس کے نکیلے ناخن گھس گئے تھے خون کی دھاریں چل رہی تھیں تھوڑی دیر اس خون کو چاٹا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر نیل گائے کے پٹھے پر دانت جمائے۔ اگلے دونوں ہاتھوں سے ران اور کمر کو دبا کر منہ کو اوپر ایک جھٹکا دیا۔ تڑاخے کی ایک آواز ہوئی ڈیڑھ سیر کا ایک ٹکڑا ران سے جُدا ہو کر شیر کے مُنہ میں آگیا۔ اس تڑاخے کی آواز سے ریچھ جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گزر رہا تھا ٹھٹک گیا۔ بھاری جھبرا سَر ہلا ہلا کر اِدھر اُدھر سونگھا۔ "دو بوئیں مشترکہ"۔ جھلا کر پنجے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھس گیا۔ بجلی کی طرح شیر شکار کو چھوڑ گھوم کے کھڑا ہو گیا۔ آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا اور راستہ روک کر سات فٹ اونچا تین فٹ چوڑا جھبرا دیو پچھلے پیروں

پر کھڑا ہو گیا۔ دھوکہ میں ریچھ آگیا تھا۔ موقع ایسا خراب تھا کہ اب ہٹنا ناممکن تھا۔ اگر وہ ایک انچ بھی گھومتا ہے تو شیر اس کو دبا لیتا ہے۔ اس لئے سیدھا کھڑا دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے مقابلے کے لئے تیار تھا۔ شیر بھی اسی طرح آمنے سامنے ہو کر حملہ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہی رہتا ہے۔ اور اب یہ دیو ہر طرح سے تیار کھڑا ہے۔ کس طرح کس پہلو سے حملہ کرے۔ دونوں مدِمقابل ایک منٹ تک اسی حالت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ شیر چاہتا تھا کہ اُس کا دشمن ذرا بھی جھکے اور وہ اس کی پیٹھ پر جا پڑے ریچھ اس داؤ میں تھا کہ شیر ذرا بھی اٹھے کہ وہ اس کے پیٹ کے نیچے گھس جاتے۔ اسی خیال سے ریچھ کچھ آگے جھکا ہی تھا کہ شیر نے تڑپ کھائی۔ دونوں ہاتھوں کے ناخونوں پسلیوں میں اور دانتوں کے کیلے ریچھ کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف گھسا دیئے ریچھ کا بھاری سر اور کھڑکھڑاتے ہوئے بڑے بڑے ناخنوں سے آراستہ دونوں ہاتھ شیر کے پیٹ کے نیچے تھے۔ ایک سکنڈ بھی نہ لگا کہ شیر کی آنتیں نکل کر اُن میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

• اِدھر تو یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر عشق کا بھوت حسبِ دستور سر پر سوار بیرو کو اندھا بنائے لئے پھر رہا تھا۔ جنگلی نیلے کی بُو پر وہ چلا آرہا تھا۔ سب بوؤں سے بے خوف اور بے خبر۔ آخر وہ اس جگہ ہی آگیا۔ جونہی وہ دونوں پتھروں کے اندر داخل ہوا۔ اس کو یہ سین دکھائی دیا۔ چھوٹی سی نکلی ہوئی چٹان پر ایک طرف نیلا بے حس وحرکت پڑا تھا۔ دوسری طرف دو زبردست ایک دوسرے میں گتھم گتھا زور کر رہے تھے۔ بیرو کو بھی اپنی طاقت پر ناز تھا۔ پھر خطرے کے موقعے پر حملہ کرنا قدرت نے اُسے سکھایا تھا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا۔ بھاری گردن اینٹھ کر درخت کا لٹھ ہو گئی۔ نومن کا سیاہ جسم اپنا پورا وزن لگانے کو تیار ہو گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر جو لپک کر ایک ٹکر لگاتا ہے۔ تو شیر اور ریچھ دونوں تین پلٹے کھا کر چٹان کے نیچے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر سے قلا بازیاں کھاتے نیچے گر رہے تھے۔

اُن کے لہو سے رنگی ہوئی چٹان پر بیرو کا کنٹھا پڑا تھا۔ جسے بیرو نے بڑے افسوس

سے دیکھا۔ شیر نے ایک پنجہ اس پر بھی چلایا تھا۔ لیکن اوچھا پڑا تھا۔ جس سے صرف کنٹھا ہی ٹوٹا۔ گردن پر زخم نہیں آیا۔ شیر اور ریچھ ایک ہزار فٹ کی مسافت طے کر کے جس وقت نیچے کی دوسری چٹان سے ٹکرائے تو بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ جس کی آواز دیر تک وادی میں گونجتی رہی۔ اور ابھی یہ گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک دھماکا پھر ہوا۔ اور پھر وادی اور اطراف کے پہاڑ گونج اٹھے۔ اب کی دفعہ بیرو نے اس نیلے کی لاش کو بھی نیچے ڈھکیل دیا تھا۔ اب خون آلودہ چٹان خالی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی بیرو وہاں ساکت کھڑا تھا۔ یکایک "پی قوں، پی قوں" کی پیاری پیاری آوازیں اس کے کان میں آئیں۔ مغرب کی طرف بیرو سے سو سوا سو فٹ اونچی ایک چوٹی پر مادینیں کھڑی ہوئی اسے بلا رہی تھیں۔

اور اُن میں وہ جا ملا۔

گوری ہو گوری

چوماسے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر، ٹر، ٹر۔ پیپل کے سوکھے ڈگالے پر اُلّو کہتا تھا۔ ہُک ہو، ہُک ہُو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر منہ پر تھپڑ مارا۔ بولی۔ "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر اُلّو بولا۔ ہُک ہو۔ ہُک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی۔ "مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہُک ہو۔ ہُک ہو۔

"اجی او جی۔ اجی او جی۔ اٹھو نا۔ گُھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا، بولا۔ "سون دے ری۔ اری نا کھلائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ اُو اُٹھو۔"

مادھو۔ "اُدھ سے تورا ڈر۔" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ کھٹیا سے نیچے

پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ پھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلجھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا۔ "جو کا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی۔ "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام بھیکا کو جگاؤ۔ ارے رمکلیا کو جگا لو۔ ارے ان ہن کی پیڑھی لو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا..... رمکلیا ہو، اری او رمکلیا ...... ہوتے جات رے۔ ارے اُٹھ اُٹھ او بھیکا۔"

آٹھ برس کی دُبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پتیا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے۔ "اری متیاری۔" موہے لئے لے باپو رے۔ اری متیاری۔"

"چپ کرو چپ۔ مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دُور کہیں سے آواز آرہی تھی۔ گڑپ۔ شل شل۔ شل۔ گڑپ شل شل شل۔

گھگو بولا۔ ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی۔ ارے پر یتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جو رے۔"

کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپ چھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اُٹھا، دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ "اجی جاوت کہاں ہو جی۔"

باہر سے آواز آئی۔ "مادھو بھیا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے اُٹھ۔"

شڑپ، گڑپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم۔ میں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ کہیں گئیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پروے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اُٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی مٹکی اٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اُسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری۔ بچھورا۔ کھری سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا۔ "بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل، ارے مادھو بھاگ۔"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا۔ رانوں تک آیا۔

"بھاگو بھاگو۔ مادھو بھئیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کا ہے ناہیں" باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ "ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے۔"

"چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لئے لوں۔ اُڑھنا بچھورا تو دبائے لوں۔"

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ "چالو۔ چالو۔ سب چھوڑ دو جان ہی بچائے لو۔ چالو۔ چالو۔"

اس گڑبڑ میں۔ جلدی میں۔ گھبراہٹ میں، اندھیرے میں دری، بچھورے کپڑوں کے لئے پکارتی۔ ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لئے پکارتی۔ برتنوں اور زیوروں کے لئے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا۔ "بھیا رے رمکلیا کو کوئی لے رے۔" لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔ "ماں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ ارے

نکس باہرے۔"

پانی کی شل شل۔ رات اندھیری۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک۔ کمر کمر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی۔ پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا۔ دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا ابھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہوکر پون میل کے فاصلے پر دُور ریل کی اونچی پٹڑی کا رُخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایکدوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا اُن کے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اُٹھا لیا تھا اُن کو اس کا اطمینان تھا۔ مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگلیہ پر اس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لئے بیتاب تھی۔ اُدھر تو وہ اِکلّا ہی رہتا تھا۔ "نہ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے آیا کہ ناہیں۔" مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دہرایا۔ "کوؤ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بروے کھولے کہ ناہیں۔"

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر دُور اور نزدیک آوازیں اُن کی آرہی تھیں۔

"جانکی ہو جانکی۔"

"آئے رہوں دادا۔"

"مرلی رے مرلی۔"

"بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔"

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا۔ " ناگا او ناگا۔" اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔ "لین کے لگے نریا ہے نریا۔" کوئی بولا۔ " سنبھلے سنبھلے نکلے چالو۔" کسی نے کہا۔ " ڈٹے رہو بھیا ڈٹے رہنا بھیا۔ آگئی لین۔"

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔ " مادھو بھیا ہو۔ کوؤ مادھو بھیا۔ دیکھو؟"

کسی نے جواب دیا۔ " بڑا دکھوئی یا ہاتھ لگ تو لوکت ناہیں۔"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا۔ " بھلی ہے بھلی۔ آت ہوں۔ بروے لے آیا رے؟"

ناگا چلایا۔ " بسنتی کتے بولت ناہیں!"

" ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بروے کتے چھوڑے؟ لے آیا رے؟"

" آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔" آر۔ کے۔ آر کی لائن پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں، چلاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد۔ سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹڑی پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سُونی پٹڑی آباد ہوگئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پُروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کُرمی کم تھے۔ بچوں میں رمکلیا کم تھی۔ بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کُرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے۔ دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ سب دلاسہ دیتے تھے۔ ہر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھو نہیں صبر کرو۔ شاید دونوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آ گیا ہوگا۔ کسی درخت پر ہی لے کر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی وہیں تھا۔ اُس نے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا۔ وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ممتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اُس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔ اور وہیں پر اُن کی گوری گائے کھڑی ارّاتی تھی۔ توکاں آں ھ، توکاں آں ھ یہ بھی دکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے نا جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے۔ توکاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتے ہوئی۔ بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور روئی۔

"گوری رے۔ موری رمکلیا۔۔۔۔۔۔ اِبھ اِبھ اِبھ اِبھ
گوری رے اب تو ہے کون چرائے۔۔۔۔۔ ایھ۔۔۔ ایھ ایھ ایھ
گوری رے اب تو ہے کون کھلائے۔۔۔۔ اوھ اوھ اوھ اوھ
گوری رمکلیا تو گئی رے۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اوھ اوھ اوھ اوھ
گوری توری رمکلیا ۔۔۔۔۔۔۔ ایھ ایھ ایھ ایھ

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ توکاں آں ھ

کوئی جانے نہ جانے دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے کر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پُروے کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اُس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پُروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے۔ مکان بہہ چکے تھے۔ اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہوگا بھی۔ تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے ہل رہے تھے اور پھر اُن کے پار۔ میلوں میلوں جہاں جہاں

تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا نالہ تھا پانی کا تیز دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی موجود تھے، رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا۔ اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈھ لیا تھا۔ جو کہ درختوں میں الجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھ کا سہارا لے اور یہ لوگ کھیتے ہوئے اسے لے جائیں مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے، پانی میں اترے ہی نہیں۔ بہت سمجھایا۔ خوشامد کی، لیکن راضی ہی نہ ہوا۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہو گیا۔ پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہو لیا۔ اور سب باری باری پٹیلے کو ڈھکیلتے ہوئے لے چلے۔ رستے میں کسی نے کہا۔ "لے اب بتائے دے۔ سانچی سانچ ناہیں ڈبوئیں دیں تو ہے اتے ہی۔" بچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارا ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے اور لبستی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا۔ لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے۔ اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس ہی سے لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے۔ پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سن کر سب نے کہا۔ "ڈبوتے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لے جاکر ایسے ڈشٹ کو۔"

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پڑی پر اتار ہی دیا۔

وہاں سیوا سمیتی کے سچے خدمت گار۔ کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والے پولیس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مددان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال، سیوا سمیتی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولیس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں اُن کی مرہم پٹی ہوئی لیکن لبنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اُس کے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ کا جانے بھور بھئے کتے چال گئی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم کردیا گزبھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں، نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جس میں سے اِکا دُکا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا۔ اور پانی ہی پانی تھا۔ جس میں بھر کی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ

کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند ھ لی تھیں اور۔ "اری مئیا ری، اور میری مئیا۔" کہہ کر بلک رہی تھی کہ اُس کے کان میں آواز آئی "تو کاں آں ھ" رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مُردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

"تو کاں آں ھ۔" آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے۔ "ہرے رام گوری بولے۔" کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا۔ "گوری ہو گوری..........."

جواب آیا۔ "تو کاں آں ھ۔"

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دُور سے ایک اور آواز آئی۔ "اوماں آں ھ۔" باغ کی آڑھ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔ "گوری ہو گوری۔

گوری ہو گوری۔

ارے گوری رے آئے جا۔

ہائے رے مئیا ناہیں آوت۔

گوری ہو گوری۔

گوری مئیا آئے جاری۔"

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سَر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اڑاکر بولی اور پھر اُدھر ہی تیرتی چلی گئی۔ جدھر سے بچھڑے کی آواز آرہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آگیا۔ جہاں پرشام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچّے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی اُس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی، اُسے سونگھا۔ ایک دفعہ اُس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچّہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آکر اپنی کمر اور پیٹ سے اُسے ڈھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچہ چھ۶ فٹ زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسّی سے بندھا ہوا تھا اور رسّی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسّی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچّہ کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رُخ کیا۔

رمکلیا رونے چلّانے کی تھکن۔ ڈر اور خوف اور آخر میں انتہائی نا اُمیدی کا اب تک مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اُس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بیہوش پڑی تھی۔ گوری نے آکر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی لمبی کھُردری گرم گرم زبان سے اُس کا مُنہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ "گوری مئیا، گوری مئیا" کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آگئی۔ اُس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور جھپٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آگئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس آگئی۔ وہی حرکتیں پھر کئی دفعہ اس کے گرد چکر لگائے اور چلی۔ جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر

گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی۔ رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹڑی کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں بہاؤ ہی کی طرف تیرتے چل دیئے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹڑی پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں گاؤں والے تھے تین میل دور یہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے۔ اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی۔ بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھچا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، بیٹھ پر رمکلیا پیچھے بچھڑا۔ "او ماں آں ھ" کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہلچل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی۔ کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی۔ اور گائے کہتی تھی۔ "تم۔ ماں آں ھ۔ ہم۔ ماں آں ھ۔"

آواز آئی۔ "بول گوری میّا کی جے۔"

پچاس آوازوں نے جے پکاری

پھر آواز آئی۔ "بول گئو ماتا کی جے۔"

آئینۂ حیرت

پہلا باب

جب دن انگڑائیاں لے لے کر رات پر دست درازیاں کر کے اپنی ساعتیں بڑھانے لگتا ہے تو افسردہ راتوں کو دن بھر کی برسی ہوئی تمازت فضا میں منتشر کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ روز گذشتہ کی تپتی ہوئی زمین پوری طرح ٹھنڈی بھی نہ ہونے پاتی کہ رات کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے۔ اُفق مغرب سے روزِ روشن جھانکتا ہے۔ تاریکی شرما کر پہاڑوں، دریاؤں، میدانوں اور شہروں پر سے سمٹی ہوئی مغرب میں جا چھپتی ہے۔ روزانہ یہی ہوتا ہے۔ رات میں راتیں دُنیا کو ٹھنڈا کرنے نہیں پاتیں کہ دن آکر اور آگ زیادہ برساتا ہے، نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ بتدریج حدّت بڑھتے بڑھتے دُنیا تپتی ہوئی بھٹی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ .... تو پھر، میدان تپتے ہیں، شہر جھلستے ہیں، زمین سے لُو کے اٹھتے ہیں۔ در و دیوار سے لپٹیں اٹھتی ہیں۔ مکانوں میں دم گھٹتا ہے۔ سڑکوں پر ہُو کا عالم ہوتا ہے۔ خاک اڑتی ہے، لُو چلتی ہے۔ جدھر جاؤ بھوبل سی جھلستی ہے۔

اس وقت جبکہ میدان خشک ہو جاتے ہیں۔ پودے جل جاتے ہیں، درخت مُرجھا جاتے ہیں۔ تب بھی مادرِ ہند کے پہلو میں ایک پُر سکون ٹھنڈا گوشۂ عافیت ہوتا ہے۔ مُردہ، خشک گرد آلود، تپتے جھلستے، دمکتے چمکتے میدانوں کو چھوڑ کر لڑکھڑاتے پرندے جانبِ شمال اُڑتے ہیں اور کوسوں، منزلوں، شمال پس شمال اُڑتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ گھنے سبز جنگلوں کا کنڈل کھینچے، سیاہ دیو ہمالہ سنہرا، روپہلا، ہیرے سے زیادہ چمکتا، برف کا تاج لگائے نظر آتا ہے۔ تھکے پیاسے، پژمردہ چڑیوں کے جھنڈ چہچہاتے اٹھتے ہیں۔ آخری منزل کا دم توڑ سپاٹا بھرتے ہیں اور پہاڑوں کے پھیلے ہوئے سبز دامنوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہاں دُنیا ہی اور ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہے۔ زمین ٹھنڈی ہے۔ پتھر ٹھنڈے ہیں پتھروں میں چھوٹے چھوٹے چشمے بہتے ہیں، وہ بھی ٹھنڈے ہیں۔ برف میں جھلا ہوا شفاف پانی، کہیں بوندوں بوندوں ٹپٹپاتا ہے کہیں مُنّی مُنّی نالیوں میں شلشلاتا اور جھلملاتا ہے۔ کہیں پتھروں کو کتراتا ہوا چٹانوں سے سلوں پر اور سلوں پر سے چٹانوں پر کودتا ہوا پانی چشموں کی صورت میں گنگناتا، مُسکراتا، ہنستا، ہنساتا ہوا بہتا ہے۔ اس کے دونوں طرف چھوٹے بڑے درخت، درختوں کے نیچے جھاڑیاں جھاڑیوں میں پودے اور پودوں کے نیچے مخملی گھاس اور کائی سب مسکراتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ بلبلیں اور شامائیں میٹھے میٹھے راگ گاتی ہیں۔ ہر طرف زلیست کے سامان ہیں۔ ہر طرف پھول خنداں ہیں۔ ہر چیز شاداب ہے۔ ہر چیز تر و تازہ ہے مٹی پر فرش سا سبزہ ہے۔ پتھر پر کائی کا سبزہ ہے۔ درخت میں ڈالیوں، پتوں کا سبزہ ہے۔ بڑے بڑے گدالوں پر فرنیں اُگ آئی ہیں۔ گویا اپنی ڈالیوں اور پتوں سے جُدا اپنا سبزہ الگ آراستہ کیا ہے۔

اس جاں فزا روح پرور آب و ہوا کا طالب کون نہیں ؟ پر جس کو اللہ مقدرت دے۔ کیا چوپائے، کیا پرندے۔ کیا انسان۔ مگر تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کو یہاں تک آنا نصیب ہوتا ہے۔

تپتا ہوا جون کا مہینہ ہے۔ پتھر کی سل، کھولتی زمین، تانبا ایسا صاف، دمکتا آسمان، تھپڑ ایسے جھلستے لُو کے جھونکے، جھلکتی، چمکتی، چُندھیائی چلچلاتی دھوپ ہے اور تین نفر دھندلے، سیاہ، ہنوز دور افتادہ پہاڑوں کی طرف رواں ہیں۔ ایک انسان

ہے۔ دوسرا جانور اور تیسرا۔۔۔۔ تیسرا۔۔۔۔۔۔ انسانوں کی گنتی میں ہے نہیں، جانور ہے نہیں۔۔۔ تیسرا ایک ڈھٹیال ہے۔ مزدوری کے بکھیڑے میں، پیسوں کے لالچ میں دھو کے میں آکر اس کھولتی ہوئی میدانی دوزخ میں تین دن ہوئے اُتر آیا تھا۔ اب اُفتاں وخیزاں واپس جا رہا ہے۔ گرمی کی شدت سے پسینے میں نہایا ہوا ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔ دماغ چکرایا ہوا ہے۔ سرد پہاڑوں کا رہنے والا، اس کی تو جان پر ہی بن آئی ہے، زندہ پہنچ جائے تو بھر پایا۔ کاٹھ گودام کی چمکتی سنسان سڑک پر جہاں بگولے اُٹھتے ہیں یہ سُست قدم چلتا ہے۔ اُسی پہاڑی تھمی ہوئی چال میں اُتو بنا تا چلا جا رہا ہے۔ اُونی کنٹوپ نما ٹوپی ڈورے سے بندھی سینے پر لٹک رہی ہے۔ سَر پر کمبل تہ کر کے رکھ لیا ہے۔ گھنے جھبرے بالوں پہ ایک تہ اور لگائی ہے۔ پیٹھ پر جو نگلے کے ساخت کی ٹوکری بندھی ہے۔ طرح طرح کے اونی چیتھڑے اور گودڑوں کا مجموعہ لبادہ در لبادہ، کہیں پوستین کے ٹکڑے کہیں لیریں۔ سب میلے، گندے، پسینے سے تر پہنے ہوئے ہے ٹانگوں میں موٹے کپڑے کا میانی کی بے جا مدد سے آزاد سِلا ہوا، چوڑے پائنچے اور تنگ مُہری کا پاجامہ اس کے نیچے ٹاٹ، نواڑ، گودڑ وغیرہ کے سے سامان سے بنے ہوئے گول مٹول، جوتے نما پھولے پھولے دو خولوں میں پیر گھسائے۔ آگے کو جھکا بھد بھد کرتا ہموار سڑک کی چڑھائی کو چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چینی ساخت کے چہرے میں چیاں الیسی آنکھیں حدت سے سُرخ، چیپڑ میں چھپاتی، دائیں طرف دُور افتادہ پہاڑوں کو حسرت سے تکتی ہیں اور پھر نگاہیں سامنے کی سیدھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر پیش قدمی میں دوڑتی ہیں اور وسعت کے گرد و غبار میں جذب ہو جاتی ہیں۔

طپش، پیاس، لُو، دھوپ، کبھی درخت اُچک اُچک کر ناچتے ہیں۔ سیدھی سڑک بل کھا کر لہراتی ہے۔ کبھی دھوپ کی تیزی بڑھتے بڑھتے سیاہی میں تبدیل ہو کر دُنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ پہاڑی ڈگمگاتے قدم ڈالتا ہوا رُک جاتا ہے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیک کر جھکا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ بتدریج تاریکی زائل ہوتی ہے۔ پھر اُسی چُندھیاتی، چلچلاتی دھوپ میں دونوں طرف کے ننگے پَت جھڑے درخت کبڈی

کھیلتے اور سڑک سانپ ایسے بل کھاتی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی کچھ آواز سنائی دیتی ہے۔ غیں غیں۔ درختوں کی آواز ہے کہ سڑک کی! درخت بھاگ رہے ہیں۔ دھند، اُوجھل اوجھل۔ پھر اندھیرا۔

غیں غیں۔ شاں۔ پھج، زرد رنگ کا بیوک کار، تین فٹ پر رُک گیا۔ "مرا سالا، لُو لگ گئی۔" موٹر ڈرائیور نے ذرا چپکے سے کہا۔

شیں شیں، چھن چھن۔ چھن چھن۔ شیں شیں۔ چھن چھن۔ ریڈی ایٹر کا پانی بولا۔

"ہٹاؤ۔ ہٹاؤ۔ جلدی کرو۔" اشتیاق علی صاحب قریشی رئیس بدایوں نے حکم دیا۔

کھڑکی کھول جلدی سے ڈرائیور کودا۔ ڈھٹیال کے پاس جا کر اُسے سڑک کے کنارے ڈھکیلنے کے بعد آگیا۔

ڈگمگاتا سنبھلتا ہوا ڈھٹیال اپنی زبان میں کچھ کہتا ہوا قریشی صاحب کے پاس سے گزرا۔ انھوں نے نفرت مائل مذاق میں کہا۔ "کیوں بے۔"

ڈرائیور نے رینگتی موٹر کو روک لیا۔ وہ سمجھا کہتے ہیں ٹھہرو۔ ڈھٹیال سمجھا اس کو بلاتے ہیں۔ پاس آگیا۔

قریشی صاحب :۔ کیوں بے کیا ہے؟

ڈھٹیال :۔ سانس پھولی ہوئی، پانی۔ پانی شاپ۔

قریشی صاحب :۔ (پیروں میں رکھے ہوئے تھرماس اور خس پوش صراحی کو دیکھتے ہوئے) احمد ٹین میں پانی ہے۔ دے دو اس کو۔

احمد :۔ (شوفر) پانی ہوتا تو ریڈی ایٹر میں ڈالتا۔ کھول رہا ہے (ٹین کو پیر سے ہلا کر) کچھ تو ہے۔ اس کے پینے بھر کو ہو جائے گا۔

احمد نے پٹرول کا ٹین جس میں پانی تھا، اٹھا کر ڈاٹ نکالی۔ اور اندر ہی بیٹھے بیٹھے باہر جھک کر ٹین کو ٹیڑھا کیا اور آواز دی۔ "او ساتھی۔ لے پانی۔ (قدرے آہستہ سے) کھول رہا ہے۔ سالے کو چاہ کا مزا آجائے گا۔"

ساتھی پر گرم پانی نے آبِ حیات کا کام کیا۔ آنکھیں کھُل گئیں۔ پانی ختم ہوگیا۔ چُلو پانی کے انتظار میں منہ سے ہی لگائے رہا۔ اور جب معلوم ہوا کہ اور نہیں ہے تو بھیگے ہوئے ہاتھ منہ پر مَل کر بولا "ساتھی دلیش جاتا۔ مشکو جانا۔ (قریشی صاحب کی طرف دیکھ کر) مے شلو شاب ؟"

قریشی صاحب نے پوچھا۔ "ابے تو چلے گا۔ بڑا شوقین (سیٹ کی طرف اشارہ کر کے) اس میں بیٹھے گا۔"

پہاڑی نے فوراً بند ہی دروازے کو پھلانگ کر اندر گھُسنے کو پچھلے ہی حصّے کے دروازہ پر جہاں قریشی صاحب بیٹھے تھے ہاتھ رکھ اندر کودنے کے لئے ٹانگ اٹھائی قریشی صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹے اور بگڑ کر بولے:۔

"ارے۔ ارے۔ خبردار۔ ادبے بندر۔ منہ لگایا تو سر چڑھنے لگا۔ کیا میری گود میں بیٹھے گا۔ چل ادھر جا۔ احمد دروازہ کھول دو، آگے بٹھالو۔" موٹر پھر چل دیا۔

دوُر سامنے سڑک کے کنارے پکّے کنویں کی جگت پر تیسرا مسافر حیوان ہی سہی (لیکن نسلِ انسان کے ارتقا کی پہلی کڑی) ایک بندریا بیٹھی ہے۔ چھپکلی کا سا بچہ۔ کچّے گوشت کا لوتھڑا۔ تین چار دن کا بچہ، سینے سے بے حس چپکا ہوا ہے۔ بندریا جگت پر بیٹھی کنویں کے اندر جھانک رہی ہے۔ اس کے چہرے پر نہایت اہم پریشان کُن خیالات کا سا گہرا اثر نمایاں ہے۔ کنویں کے اندر ٹھنڈا شفاف پانی جھلملاتا ہوا مسکرا کر اپنے عقب میں تصویرِ حیرت بتلاتا ہے ایک دوسرے کنوئیں کا دائرہ ہے اور اس میں ایک دوسری بندریا بچہ لئے جھانک رہی ہے۔ اُدھڑے ہوتے پلستر میں سے چونے کی ایک بہت چھوٹی کنکری بندریا کے ہاتھ سے اندر گرتی ہے۔ ٹپ سے ہوتا ہے۔ سطحِ آب لہریں لے کر کھلکھلا اُٹھتی ہے۔ نقشِ حیرت ہیجان میں پڑ جاتا ہے۔ پانی، پانی بندریا پر پانی کا احساس غالب آتا ہے۔ پانی دسترس سے باہر ہے۔ وہ عجلت کے دو کھرونچوں سے سَر کھُجا کر کنویں کے مونگھڑ پر بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں طرف دیکھتی ہے۔

کنویں کی جگت کے نیچے ایک جگہ پر فٹ بھر مٹی نم ہے۔ بندریا کُود کر اُس پر جا بیٹھتی ہے۔ تَر مٹی کو ہتھیلی سے چھوتی ہے۔ ناخونوں سے کُرید کر تولہ بھر مٹی اٹھاتی ہے۔ لیکن فوراً ہی اُسے پھینک کر ایک پرانی ماچس کی ڈبیہ جو وہاں پڑی ہوئی ہے اُسے اٹھاکر نوچنے کے بعد پھر کنویں کے کنارے جاکر اندر جھانکتی ہے۔ پانی ہے۔ پانی میں عکس ہے۔ بندریا کی بھویں پہلے انتہائی حیرت کا اثر اوپر کھینچتی ہیں، پھر غور و فکر کا اظہار۔ نیچے سکڑتی ہیں لیکن یہ سب ظاہرا نقشے ہیں۔ حیرت اور استعجاب دُکھ اور تکلیف، محبت اور حسد۔ محبت اور رشک۔ ضرورت اور جستجو کے جذبات میں ثمرِ گناہ پیدا کرنے والی چیز۔ سوچ یعنی تسلسلِ خیال سے دماغ مبرّا ہے۔ جذبات سطحی ہیں۔ افعال حسِ حیوانی کے تابع ہیں۔

شاں، کر کے موٹر آیا۔ کچھ سے رُک گیا۔ ریڈی ایٹر کا پانی کھول رہا ہے۔ شیں شیں شیں شیں۔ چھن چھن۔ چھن چھن۔ شیں شیں۔ چھن چھن چھن۔ بندریا دو پھلانگوں میں پاس کے پاکھر (درخت) تک پہنچ ایک ہی جست میں اوپر کے ٹہنے پر اچک کچھ دیر موٹر کو کھیسیں دکھاتی ہے اور جب اس طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا تو کنوئیں کی طرف آدھی بیٹھ موڑ کر اُن سے بے واسطہ ہو کر مطمئن، سنجیدہ اور متفکر چہرہ بناکر بیٹھ جاتی ہے۔

"اُٹھ بے اُٹھ۔" احمد نے موٹر سے باہر کود کر ڈھٹیال سے کہا اور دو، تین دھکوں کے بعد اسے اونچا کر کے سیٹ کے نیچے سے پتلی سُتلی نکال کر ٹین میں باندھ کے کنویں پر گیا۔ پانی بھر کر نکالا۔ ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھٹیال نے جو یہ دیکھا بیتا بانہ اپنے کو سمیٹتا، اپنے کو بھینچتا اسٹیرنگ گیر اور لیوروں میں سے اپنے اُلجھنے والے چیتھڑوں کو سلجھاتا موٹر سے باہر نکل احمد کے پاس چُلّو منہ سے لگاکر بیٹھ گیا۔ "شاتھی پانی۔ شاتھی پانی۔"

ساتھی احمد نہایت اطمینان سے ریڈی ایٹر میں پانی بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ

خالی ہو گیا۔ تو وہ پھر کنویں پر گیا۔ ڈھٹیال بھی ساتھ ساتھ گیا۔ جگت کے نیچے چلو لگا کر بیٹھ گیا۔ "شاب پانی، شاب پانی۔" احمد ٹین بھر کر ڈھٹیال کو وہیں چھوڑ کر موٹر کی طرف چلے تو قریشی صاحب موٹر میں سے بولے "ارے پلا دو۔ پہلے اسی کو پلا دو۔" لیکن منہ چڑھے ڈرائیور نے فکر نہ کی۔ پانی ریڈی ایٹر میں ڈالنے لگا۔ ڈھٹیال پھر اُن کے پاس آ گیا۔ آدھے سے کچھ کم ٹین بچا ہوگا۔ ریڈی ایٹر منہ تک بھر گیا۔ تو احمد نے پہاڑی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے چُلو لگا کر بیٹھ گیا اور اس قدر پانی پیا کہ ٹین خالی ہو گیا۔ احمد نے کہا۔ "سالا پیتا ہی چلا جاتے گا۔" سالے نے اور پانی مانگا۔ احمد نے تیسرا ٹین بھر اور پھر پلایا۔ جب ڈھٹیال سیر ہو گیا تو ٹین میں کا پانی وہیں گرا کر احمد اور وہ دونوں موٹر میں آ گئے۔ اور موٹر بھنبھنا کر اور گنگنا کر ایک دفعہ پھر گرد آلود سڑک پر اور زیادہ گرد اڑاتا ہوا سپاٹے بھرنے لگا۔

موٹر کے ہٹتے ہی درخت سے کود کر بندریا اس جگہ آ گئی جہاں بچا ہوا پانی پھینکا گیا تھا۔ جو کہ قریب قریب سب ہی پیاسی زمین جذب کر چکی تھی۔ صرف پیالی سوا پیالی پانی ہتھیلی بھر کے گڑھے میں باقی تھا۔ اسی پر اگلے دونوں ہاتھ ٹیک کر جھک گئی۔ تھوڑا سا پانی پی کر زمین پر ہاتھ ٹیکے ٹیکے سیدھی ہوئی۔ سر جھکا کر اپنے بچے کو دیکھا اور پھر پانی پر جھک گئی۔ پانی ختم ہو گیا تو پھر ویسے ہی اٹھی۔ ایک ہاتھ اٹھا کر ٹھوڑی کے تر بالوں کو کھسوٹا اور پھر جھکی اور پھر سیدھی ہو گئی۔ پانی اب نہ تھا۔ کیچڑ پر سے آہستہ سے ہتھیلی رکھی اور تر ہتھیلی چاٹ لی۔ دو چار مرتبہ یہی کرنے کے بعد سینے پر چمٹے ہوئے بچے کو جلدی سے ایک ہاتھ سے تھپکی دے، دُم اونچی اٹھا درختوں کے نیچے نیچے سڑک کے کنارے کنارے چل دی۔

اتنے عرصہ میں گرمایا، بھنایا ہوا موٹر لُو کے تھپیڑوں سے لڑتا بھڑتا گرد میں خود لپٹا۔ گرد اُڑاتا۔ راہ چلتوں پر غیں غیں غُراتا، میلوں کو چاٹتا کوسوں نکل گیا تھا۔ دُور سڑک کے دونوں طرف پتھر کی متعدد چار دیواریاں اور چند مکان کاٹھ گودام کی قربت ظاہر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کے پھیلے ہوئے دامن جو پہلے دھندلے، سیاہ

تھے اب سبز درختوں کا لبادہ پہنے نظر آنے لگے۔ دو چار بیل گاڑیاں اور گاہ بگاہ چند اُجڑے ہوئے راہ گیر بھی سڑک پر ملنے لگے۔ یہاں تک کہ نیچی نیچی احاطہ کی دیواریں اُن کے اندر کیلے اور پپیتے کے درخت اور درختوں کی آڑ میں مکان یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ حتیٰ کہ موٹر کاٹھ گودام شہر میں اور پھر بازار میں سے ہو کر گزرا۔

یہاں موٹر نے بہت سے اپنے ہم جنسوں کو دیکھا۔ جن میں کہ لاری قوم کے افراد زیادہ تھے۔ مگر ہمارا موٹر بازار میں سے ہوتا ہوا کئی پٹرول کی دکانیں چھوڑتا ہُوا بغیر رُکے آخری پٹرول پمپ کے پاس جاکر رُک گیا۔ یہ دکان شہر کی آخری شمالی دکان تھی۔ جہاں سے آگے اب باقاعدہ چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ موٹر روک کر احمد اُترا۔ رومال سے منہ کی خاک پونچھی۔ پھر ڈھیال کو ڈھکیل ڈھکیل کر نیچے اُتارا۔ اس کو لُو لگ چکی تھی۔ بدن پھُک رہا تھا۔ سینے میں آگ لگی تھی۔ وہ بیچارہ کچھ اور سمجھا۔ چلّو لگا کر پانی کے واسطے بیٹھ گیا۔

احمد۔ ”واہ بیٹا مزے میں آ گئے۔“ آہستہ آواز میں کہتے ہوئے موٹر کا پٹرول ناپنے لگا۔ پٹرول دینے والا آ گیا تھا۔ چار گیلن پٹرول موٹر میں ڈلوا کر نہایت احتیاط سے پمپ کی موٹی ربڑ کی نلکی کو سُونتنے لگا۔ پمپ والے آدمی نے ڈھیال کو غور سے دیکھ کر دبی زبان میں احمد سے پوچھا۔ ”اسے کہاں سے پکڑ لائے۔“

احمد نے کہا۔ ”زبردستی سالا سر پڑ گیا۔ صاحب نے بٹھا لیا ہے۔ پانی ہو تو لاکر پلا دو۔ سالا مر رہا ہے۔“ اس کے بعد قریشی صاحب کے پاس آیا۔ پوچھا۔ ”کچھ چاہیئے؟“ صاحب نے اشارہ کیا۔ احمد نے نہایت احتیاط سے صراحی میں سے پانی اور تھرماس میں سے برف ملا کر صاحب کو پانی دیا۔ پھر خود موٹر کی آڑ میں پانی پی کر صراحی اور تھرماس کو اپنی جگہ پر رکھ، بچی ہوئی برف کی ڈلیاں اس گال سے اس گال میں گھماتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا ڈھیال کے واسطے بھی پانی آ گیا تھا۔ جب وہ پی کر آ گیا تو پوچھا ”کہاں جائے گا؟“ معلوم ہوا بیر بھٹی۔ صاحب نے کہا ”بٹھا لو، کیا ہرج ہے۔“

احمد نے سلف اسٹارٹر پہ پیر رکھا۔ موٹر گنگنا کے بھڑ بھڑایا اور آگے کو رینگا۔ لیکن فوراً ہی لاغر صورت، پریشان بال، جھبری ڈاڑھی کا ایک نوعمر آدمی، سیدھے ہاتھ میں پنسل، اُلٹے ہاتھ میں بہت بڑا رجسٹر لئے موٹر کے آگے آیا۔ گاڑی روک لی گئی تھی۔ ریڈی ایڈیٹر کی طرف جُھکا۔ غور سے اُسے دیکھا ہی ہی، ہی ہی کر کے ہنستا ہوا سیدھا ہوا۔ پنسل اور رجسٹر آگے بڑھا کر نہایت صاف انگریزی میں گویا "NOW THEN MY LORD" لیکن کسی جواب کا انتظار کرنے یا اس سے آگے کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے بغیر وہ پھر ریڈی ایٹر کی طرف جھکا۔ اس کے وسط میں غور سے دیکھنے کے بعد پھر ہنسا اور پھر وہی کہا۔ "NOW THEN MY LORD"

احمد اور قریشی صاحب دونوں نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں، تم کون ہو؟"

اب اُس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا THEREIS MY CARD اور پھر بغیر کارڈ نکالے گویا ہوا۔ "آپ انگلش میں سوچتے ہیں یا اردو میں"

قریشی صاحب تو چُپ رہے۔ احمد نے جلدی سے جواب دیا۔ "اردو میں بات کیجئے اردو میں۔ آخر مطلب کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بہتر ہے۔ اردو ہی میں سہی۔ میں آج آپ کو تفکراتِ انسانی کے ارتقائی مراحل کا زندہ اور جاوید نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گو میں نے تمام دنیا کے انفرادی اور اجتماعی وسوسات اور احساسات کا تنقیہ، تزکیہ اور تبصرہ اس رجسٹر میں نقش کالحجر کر لیا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے محترم و معظم سامعین کی خاطر یہ خاکسار یعنی پروفیسر دیاشنکر دوبے المتخلص بہ وجدؔ جو بہ تمام عجز و انکساری اس وقت معزز مجمع کے آگے حاضر ہے۔ فلسفۂ ریڈی ایٹر کو انہماکِ خیال میں تیتنغ دیکر بتائے گا۔" یہ کہتے ہوئے پھر وہ ریڈی ایٹر کی طرف جُھکا۔

احمد نے کہا۔ "الہٰی توبہ یہ کون صاحب ہیں۔" قریشی صاحب حیرت زدہ خاموش تھے کہ اتنے میں پٹرول پمپ والا دوڑا۔ اور آتے ہی پروفیسر صاحب کو دھکے دیکر

موٹر کے سامنے سے ہٹا کر بولا۔ "جلدی نکال لو۔ پاگل ہے پاگل" احمد نے موٹر بڑھایا اور جب پروفیسر صاحب کے برابر سے گذرا تو قریشی صاحب نے دیکھا کہ وہ جسم کے صرف بالائی حصّے پر کپڑوں کا استعمال روا رکھتے تھے۔ ٹانگیں دھوتی، پاجامہ یا پتلون کے احسان سے شرمندہ نہ تھیں۔

موٹر پھر روانہ ہوا۔ ایک فرلانگ سیدھی چڑھائی پر دوڑنے کے بعد بائیں طرف گھوما۔ سو قدم سیدھا چلا اور پھر دائیں کو چلا۔ اب قاعدہ چڑھائی کی بل کھاتی، لہراتی، ہر ہر قدم اوپر کی طرف جاتی سڑک شروع ہو گئی۔ موٹر نے دو چار چکّر اور کاٹے ہوں گے کہ ایک دفعہ گنگناتا ہوا پھر جو گھومتا ہے تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جاں بخش جھونکا آکر موٹر کی بلائیں لیتا ہوا نکل جاتا ہے اور پھر دوسرے ہی موڑ پر پُل سے گزرتے ہی متعدد اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ اُن کے بعد اور۔ اور اُن کے بعد اور۔ لُو ایک ہی منٹ میں رُت بدل گئی۔ منظر بدل گیا۔ جان میں جان آگئی۔ چڑھائی پر ابھی ابھی جب روانہ ہوئے تھے تو سیدھے ہاتھ پر چوڑے نالے کی خشک تلی میں، ریتے اور بجری میں بوئے ہوئے جھلستے ہوئے بڑے بڑے پتھر، دھوپ میں چمکتے ہوئے آنکھوں کو پتھراتے تھے۔ دوسری طرف آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ کی دیوار سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس پر لگی ہوئی زندہ اور مردہ سبز اور بھوری گرد میں تپتی ہوئی جھاڑیاں گرم آہیں بھر کر گرد اڑانے والی موٹروں کو کوستی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سب منٹوں میں بدل گیا۔ تر و تازہ مست جھومتے ہوئے درختوں، شاداب مسکراتی ہوئی چٹانوں کے درمیان موٹر بھاگنے لگا سڑک بل پر بل اور گنڈلیوں پر گنڈلیاں کھاتی نکلے دامنوں پر سے صدقے ہوتی۔ دھنسی ہوئی کھوؤں کی بلائیں لیتی، ہر ہر قدم پر رُخ بدلتی، سیاہ دیوارِ کوہ پر ہلکی بھوری لکیر سی نظر آنے لگی۔ اور موٹر بھنبھناتا ہوا چھوٹا سا زرد بھونرا معلوم ہونے لگا۔

موٹر کی ان ہر دم چکّر گھمنیوں سے جس میں کہ انسان کا خود بھی آزو بازو جھکتا

رہتا ہے۔ اکثر آدمی کا جو عادی نہیں ہوتے سر گھومنے لگتا ہے اور استفراغ ہو جاتا ہے بیچارہ ڈھیال سب سے پہلی سواری پر اسی موٹر میں بیٹھا تھا۔ اور گو ٹھنڈی ہوا سے ہوش و حواس آ گئے تھے۔ لیکن پیٹ میں بھرا ہوا ڈھائی کنستر پانی اس ہلچل سے بھونچال میں آیا ہوا۔ سر کے چکروں کا پھسلایا ہوا، منہ کے ذریعہ واپس نکلنے کے واسطے طوفان مچاتے ہوتے تھا۔ ڈھیال کو اس لذت سے بھی پہلی ہی دفعہ شرف حاصل ہوا تھا جونہی منہ بھر پانی پہلی اُبکائی کے ساتھ نکلا اُس نے مزید احتیاط کے واسطے دونوں ہاتھوں سے دبا کر اپنا گلا پکڑ لیا۔ لیکن اس حرکت نے صرف اتنا ہی کیا جو کھلی ہوئی سوڈے کی بوتل پر ہتھیلی رکھ دینے سے ہوتا ہے گھٹ گھٹا کر پھر جو پورے زور سے نکلا تو منہ سے پانی کی دھار سامنے کی گھڑیوں میٹروں اور لیوروں پر پڑتی چلی گئی۔

احمد نے فوراً موٹر روک کر مُکا درست کیا۔ پھر اُسے ناکافی سمجھتے ہوئے جھک کر موٹر کا پمپ اٹھایا۔ وہ ضرورت سے زیادہ شدید معلوم ہوا تو اسے بھی پھینک اب ایک ہاتھ ماتھے پر اور دوسرا اسٹیرنگ گیئر پر رکھ بے بسی کی تصویر بن کر بیٹھ گیا۔ قریشی صاحب کسی سوچ میں تھے چونک کر ڈپٹے "کیا بات ہے جی!"

احمد نے روتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "قے کر رہا ہے۔"

قریشی صاحب:۔ ارے، ارے۔ یہ کیا۔

احمد:۔ آپ نے بھی کیا بیکار کی بلا پالی۔ سالے نے سب نجس کر دیا۔ توبہ توبہ! میرے پیر بھی سَن گئے۔

قریشی صاحب:۔ اُتارو۔ اُتارو۔ اُتار دو۔

احمد:۔ اُتر سالے، اُتر۔

جس جگہ ڈھیال کے بار سے سبکدوش ہونے کے لئے موٹر روکا گیا تھا، وہیں پر ایک جگہ بہت چھوٹا سا چشمہ چٹانوں میں سے نکل کر جنگلی اسٹابریوں میں بل کھاتا۔ کسی مردِ خدا کے کھوسے ہوئے گھیکوار کے پتے پر سے دھار کی صورت

میں سڑک کے کنارے کی نالی میں گر رہا تھا۔ احمد نے اس ہی میں سے پانی بھر بھر کر کچی اور پکی اسٹابریاں کھاتے اور تھوکتے ہوئے موٹر کو دھو کر صاف کیا۔ ادھر سڑک کے دوسری جانب انتہائی مخدوش کھڈ کے کنارے ڈھٹیال بھی پاجامہ کھسکا کے صفائی میں مشغول ہوئے۔ قدرت بر سر امداد تھی۔ ہر رستے سے لُو کی گرمی نکلنے لگی۔ بول و براز اور استفراغ سب ہی جاری ہو گئے اور اسی حالت میں اُن کو چھوڑ کر موٹر روانہ ہو گیا۔ اور موٹر کے روانہ ہوتے ہی جناب اشتیاق علی قریشی رئیس بدایوں کے دماغ سے ہمیشہ کے واسطے ڈھٹیال کا خیال بھی اپنے آپ جدا ہو گیا۔ البتہ مانگ پٹی والے چکنے چپڑے، اترن کی ریشمی قمیص پہننے والے میاں احمد ڈرائیور کچھ دیر تک ڈھٹیال اور اس کی ماں بہنوں کو زیرِ لب یاد کرتے رہے اور پھر وہ بھی بھول گئے۔ موٹر نینی تال کے میل ۱۹ پر پہنچ گیا تھا۔ سامنے سیمنٹ کے پل کے پار جہاں سڑک قدرے چوڑی ہے وہیں سے ایک راستہ اور نکل کر دو چار بل کھاتا چیڑھ کے درختوں میں ہوتا ہوا سونٹ کے قریب اور اوپر چڑھ کر قریشی صاحب کے بنگلہ میں پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا باب

موٹر کے بیٹھنے والے سنسناتے ہوئے منٹوں میں پہاڑ پر پہنچ گئے۔ لیکن ہماری بندریا ابھی سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے نیچے جا رہی ہے۔ رفتار سست سہی پر دُم تنی ہوئی ہے۔ اور چونکہ ہر ہر قدم پر ایسی عجائباتِ قدرت سامنے پڑ جاتی ہیں، جیسے کہ پی ہوئی بیڑیوں کے سرے، کاغذ کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور درختوں کی جڑوں میں مکڑی کے جالے وغیرہ، لہٰذا ان کے معائنے اور مشاہدے میں اور بھی زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ پھر ان ہی چیزوں پر موقوف نہیں، سڑک کے درختوں میں جامن آم اور نیم کے بھی متعدد درخت موجود ہیں۔ جن میں کہ مرتا ہوا بور اور بڑھتے ہوئے پھل بھی موجود ہیں۔ بندریا کے لئے اُن کی دیکھ بھال بھی ضروری ہے۔ غرضیکہ اطمینان کے سفر اور ان مشغلوں میں بہت جلد شام ہونے لگی۔ ایک جگہ بکٹھی جامنیں اور کھٹی کیریوں کے بعد نیم کی کڑوی نمکولیوں سے بندریا منہ کا مزہ بدل رہی تھی، کہ ایک تلک دھاری مہاتما کا گزر اِدھر سے ہوا اپنا پیٹ کاٹ دو مٹھی چنے بندریا کے واسطے سڑک کے کنارے سرے کی جڑ کے پاس رکھ خاک اڑاتے چنے پھانکتے چل دیئے۔ بندریا نے، نمکولیاں اور سوکھا بور بیتا چھوڑ جڑ کی طرف یورش کی۔ دو مٹھی بھنے ہوئے چنوں کی ڈھیری اُن ہی کے لئے حاضر تھی۔ بھوجن شواد شٹ تھا۔ دونوں ہاتھ چلنے لگے۔ جلدی جلدی اِدھر اُدھر سر گھما کے دیکھنا اور دونوں ہاتھوں سے چنے اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھنا شروع کر دیا۔ چنوں کی ڈھیری غائب ہونا اور بندریا کے دونوں گالوں میں دو غدود اُبھرنا شروع ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ غدود بڑھتے بڑھتے تھیلوں کی طرح لٹک پڑے۔ چنے اب ختم ہو چکے تھے۔ اِکا دُکا جھانکتے ہوئے یا چھپے ہوئے دھول میں باقی تھے۔ اور بندریا کبھی سیدھے اور کبھی الٹے ہاتھ سے مٹی کو

منتشر کر کے اُن ہی کو چُن رہی تھی کہ ایک راہگیر اور آتا ہوا نظر آیا۔

گو یہ مسافر قد میں بندریا سے کچھ زیادہ بڑا نہ تھا۔ لیکن تھا انسان اور بڑے ٹھاٹ کے ساتھ تھا۔ سر پر چار بَل کھائے موٹے گاڑھے کا صافہ، پیروں میں چونچیں اٹھائے ایڑیاں لچکائے، کچے چمڑے کا جوتا۔ کسی اور کھُسی ہوئی دھوتی باندھے۔ آنکھوں کی قربت میں آدھے منہ پر کاجل لگائے ٹپکنے پر آمادہ صندلی رینٹا، بیہم سڑپتا، ایک ہاتھ میں سینٹا لئے دوسرے ہاتھ سے سر پر کی چھوٹی پٹلیا تھامے بندریا پر نگاہیں جمائے ٹھٹکتا چلا آرہا تھا۔ جب بندریا اس کی طرف دیکھے تو رک جائے۔ اور جوں ہی وہ چننے چُننا شروع کرے تو وہ رک جائے۔ اسی طرح کرتے کرتے بندریا کے برابر آگیا۔ اب بندریا نے سر اٹھا کر لڑکے کو غور سے دیکھا۔ لڑکا رک گیا، سینٹا اٹھایا۔ بندریا آزمانے کے خیال سے ایک قدم اس کی طرف بڑھی۔ لڑکا گلا پھاڑ کر چلایا " ہو دادا ہو دادا " اب کیا تھا معلوم ہو گیا۔ لپک کر بندریا اس کے پاس پہنچی۔ لڑکے کی گھگی بندھ گئی۔ " ہے ہے ہے ہے "۔ بندریا نے ہر ہر قدم پر بھپکی دینے کے تین تین چار چار ڈنڈ پیلتے ہوئے ایک ایک قدم آگے بڑھنا شروع کیا اور لڑکا " ہے ہے ہے ہے " کرتا اور سینٹا اپنے آگے ہلاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی گڑبڑ میں سر پر کی پوٹلی ایسا معلوم ہوا کہ اپنی نشست پر سے ڈر کر بھاگی سڑک پر لڑھکنے لگی۔ بندریا پوٹلی کی طرف دوڑی اور اسے پکڑا، بھنگی بدوش دادا، جن سے اس شد و مد کی امداد طلب کی گئی تھی۔ بھنگی بیچ سڑک پر چھوڑ ٹیکن کی چڑیا دار لکڑی ہاتھ میں لئے۔ " اے تور بہنیاں، اے تور بہنیاں " کرتے ہوئے بھاگے۔ بندریا نے ایک ہاتھ میں پوٹلی پکڑ لی۔ تین ٹانگوں پر اُچکتی درخت تک بھاگی۔ لمحہ بھر نیچے جست کے واسطے رُکی۔ اور پھر ایک دو اور تین ہی چھلانگوں میں درخت کی سب سے اونچی ڈال پر بیٹھ گئی اور حالانکہ دادا اور درخت کے نیچے کھڑے " اے تور بہنیاں " کا وظیفہ اور لکڑی کے چڑیا دار سرے کی گردش بڑے ہی زور شور سے فرماتے رہے لیکن چوٹی کے اوپر بیٹھی ہوئی بندریا پوٹلی کو نوچ نوچ کر اس میں کی اشیائے خوردنی اس طرح کھاتی رہی جیسے اس سے کوئی مخاطب ہی نہیں ہے اور اُدھر کچھ دُور سڑک کے

بیچوں بیچ رکھی ہوئی بہنگی پر، نہ معلوم کہاں سے نکل ایک لال پچھاوے والے جعادری بندر صاحب نہایت اطمینان اور انہماک سے مصروف ہو گئے۔ گویا بہنگی ان ہی کی ہے۔ اور آپ ٹوکرے میں آدھے دھڑ سے اندر جھکے ہوئے کسی ضروری چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

فلک آشیانی بندریا کو چھوڑ، دادا صاحب اب بہنگی کی طرف متوجہ ہوئے اور جب جعادری سے اپنی بہن کی شان میں ہتک آمیز جملے برداشت نہ ہو سکے تو انہوں نے بھی جلدی میں جو بھی ہاتھ پڑا لے، تین ٹانگ پر اُچکتے ہوئے ایک دوسرے درخت پر آسن جمایا۔ اور چونکہ ان کے حصے میں تمباکو کی پوٹلی آئی تھی اس لئے بڑی دیر تک سونگھ سونگھ کر تمباکو نیچے ٹپکاتے رہے۔ یہاں تک کہ بہنگی، دادا، اور تین فٹے پوتے نظروں سے غائب ہو گئے اور جب بندر اور بندریا دونوں اپنی اپنی پوٹلیوں سے فارغ ہو گئے تو بندر تیزی کے ساتھ اور بندریا ڈرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے درخت سے نیچے اترے اور بھبکیا کر بندر بندریا پر جھپٹا۔

دراصل یہ بندر کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اسی بندریا کا بندر ہے اور انہیں کے لختِ جگر بندریا کی گود میں ہیں۔ لیکن چونکہ یہ صاحب وسیع خرچ شوقین طبع، خاندانی بندر ہیں، آپ کی دس بارہ بیویاں اور ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے اور بندر کی ٹولی کے ساتھ مل کر بغرضِ سیر و تفریح اور تبدیل آب و ہوا گرمیوں میں پہاڑ پر جا رہے ہیں اور دورانِ سفر میں بندریا کے بے موقع زچہ خانہ کی وجہ سے اُسے تنہا چھوڑ کر ہی آگے بڑھ جانا پڑا تھا اور چونکہ بندروں کی اس ٹولی کی رفتار بہت کم تھی (جیسا کہ ہونا چاہیئے) اس لئے بندریا زچہ خانہ، چھٹی چلّہ سب سے ایک ہی ساتھ جلد فارغ ہو، پھر روانہ ہو گئی تھی اور اب ٹولی کے پاس آ گئی تھی جس سے کچھ دُور پر ٹہلتے ہوئے بندر سے اب ملاقات ہو گئی تھی۔

جعادری صاحب ان سے بے حد خفا تھے۔ اُن کی شکایتیں بھی جا بے تھیں۔

بے وقت کا زچہ خانہ، پیچھے رہنا، دیر میں آنا وغیرہ وغیرہ۔ خوخیاتے، بھبکیاتے پہنچے اور بڑی طرح بندریا کی خبر لی۔ انتہا یہ کہ دُم پکڑ پکڑ کر کھینچی (جو کہ انسانوں میں عورت کی چوٹی پکڑ کر کھینچنے کے برابر ہے) بندریا نے سب ہی طرح معافی مانگی۔ ہاتھ جوڑے، اپنی مجبوریاں پیش کیں۔ اپنے عذر بیان کئے۔ لیکن کس طرح سے....؟ بولی اور لفظوں میں نہیں... جھُرجھریاں لیں، ماتھے پر ہاتھ رکھ کرتی قی قی کی۔ اور جب بھی ظالم بندر کو رحم نہ آیا تو چاروں ہاتھ پیروں کو سمیٹ پیٹ کے بل زمین پر لیٹ، منہ اونچا کر کے، دونوں باچھیں کانوں تک پھاڑ۔ کچ کچ۔ کچ کچ۔ قی قی۔ کچ کچ، کچ کچ۔ قی قی۔ کرنے لگی اور جب (اللہ کی پناہ) دُم کھینچی گئی۔ پیشاب خطا ہو گیا۔ (مار بڑی چیز ہے) خیر بہزار خرابی بندر صاحب کا غصہ جو رہ رہ کے واپس پلٹتا تھا دفع ہوا۔ اور جب دونوں میں کچھ میل ہو گیا تو بندر کے پیچھے پیچھے بندریا اس طرف روانہ ہوئی جہاں بندروں کی ٹولی نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

—————.....—————

سڑک سے سو گز کے فاصلہ پر، نالے کے پار چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور معمولی قد کے درختوں سے گھرا ہوا برگد کا شاندار پیڑ جٹیں اور ڈاڑھیاں لٹکائے بڑے تنے کے علاوہ، دس بیس اور ستونوں کا سہارا لئے، گہرے سبز پتوں کا سایہ کئے کچی پکی برگدیوں سے لدا ہوا دو منزلہ، سہ منزلہ، عالی شان محل سا کھڑا ہے۔ اور اس میں بندر لوگوں کا قیام ہے۔

کیا چہل پہل ہے کیسی رونق ہے۔ کیا زندہ دلی ہے۔ برگدیاں کھائی جا رہی ہیں۔ کھیل کود ہو رہے ہیں۔ کہیں ورزش ہو رہی ہے۔ کُشتی لڑی جا رہی ہے۔ جھولا جھولا جا رہا ہے۔ ایک بندر برابر کی ڈالی سے اچک کر جھولنے والے کے پیر پکڑ جھولنے لگتا ہے۔ لو ایک کے اوپر دوسرا دونوں جھول رہے ہیں اوپر والا ڈالی چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں گدا بد نیچے گرتے ہیں۔ اور گرتے ہی اٹھ کر بھاگتے ہیں۔ کوئی کسی کو نوچ کر بھاگا ہے۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا ہے یہ ڈال ڈال ہے تو وہ پات پات ہے۔ ایک صاحب موٹے ڈگالے پر چت لیٹے

دونوں ہاتھ سر کی طرف پھیلائے ہوا کھا رہے ہیں۔ (کروٹ لیں تو نیچے) ایک بندر یا بندر کی جوئیں پا رہی ہے۔ بندر صاحب ہاتھ سر کی طرف پھیلائے بغل کھولے بیٹھے ہیں۔ بندریا کا منہ پُلنخ پُلنخ چل رہا ہے۔ دو ایک جوئیں اصلیت میں اور سینکڑوں تصوّر میں کھا رہی ہے۔ ایک اور بندریا اُن کو رشک سے دیکھ کر آہستہ آہستہ قریب آتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر بندر کی پیٹھ چھوتی ہے۔ دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کو بھی یہ شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن نہیں۔ بندر لیٹے ہی لیٹے خوخیاتا ہے۔ معتوب جورو اچک دُور ہو بیٹھتی ہے۔ مدنظر لاڈلی انچ بھر اور قریب کھسک دُگنی تیزی سے پُلنخ پُلنخ منہ چلانے لگتی ہے۔

دو بچوں نے بازی بدی ہے، کُشتی لڑ رہے ہیں۔ ماں پاس بیٹھی موزہ بُن رہی ہے ارے توبہ! پیٹ کا گھونسلا نوچ رہی ہے اور غرور سے ہونہار سپوتوں کو دیکھ رہی ہے سپوت ذرا کم عمر ہیں۔ دونوں ہاتھ اونچے کر کے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر لڑنے کو تیار ہوتے ہیں۔ ایک تناسب سے بھاری سر کا جھونک، بگڑنے سے اپنے آپ چت گرتا ہے۔ دوسرا اپنی ہی نامعقول دم کو جو بلاوجہ سامنے آجاتی ہے، پکڑ کر کھینچتا ہے اور لامحالہ وہ بھی لڑھک جاتا ہے۔ ایک صاحب ان دونوں کے سر کے اوپر پیروں سے ڈالی پکڑے الٹے لٹکے ہر لمحہ اُن پر گرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اور چونکہ بندر لوگ بھی ہم لوگوں کی طرح زندگی کے صرف چار اہم مقاصد پورے کرتے ہیں۔ یعنی پیدا ہوتے ہیں۔ پیٹ پالتے ہیں۔ پیدا کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں بھی چند بدنصیب غمزدہ اور مُردہ دل ضرور ہونا چاہئیں۔ اور ہیں بھی ایک بندریا سات دن سے مَرا ہوا بچہ دبائے دبائے پھر رہی ہے۔ ابھی بچہ کا سَر لٹک پڑا ہے اُسے غور سے دیکھ رہی ہے (دل کی کیا حالت ہوگی) ایک بوڑھی بندریا جس کے بہت سے نواسے اور پرنواسے اسی ٹولی میں کھیل کود رہے ہیں۔ بڑ کے درخت کے پاس اکڑوں بیٹھی ہے۔ لمبے ہاتھ گھٹنوں پر ٹکے ہوئے آگے پھیلے ہیں۔ بدن پر چمکتی ہوئی پوستین کے بجائے لمبے اور چھدرے بال بے ترتیبی سے منتشر ہیں۔

لٹکی ہوئی بھوں کے نیچے معمول سے کہیں زیادہ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ یہ گھنٹوں ایک جگہ نگاہیں جمائے اسی حالت میں بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی سوکھا پتہ ہوا میں تلملاتا اس کے کان کے پاس سے گذرتا ہے تو سر ایک طرف جھکا کر پتے کو گر جانے دیتی ہے اور پھر ویسے ہی بیٹھ جاتی ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

زندگی! پُر عیش و پُر کیف زندگی۔ بچپن کی پُر سحر بے فکر زندگی۔ جوانی کی مست زندگی کیا تو اسی واسطے عطا ہوئی تھی کہ وقتِ آخر تیری یاد کے تازیانے پشتِ خمیدہ کی دھجیاں اڑائیں۔ مگر نہیں، یہ تو میں اپنی حالت لکھ گیا۔ کھری کھٹیا پر بیٹھا، حقّہ کی نلی منہ سے لگائے، ناک پر رکھی عینک کا ڈورا سر کے گرد لپیٹے۔ ہاتھ میں پینسل سامنے بادامی کاغذ کا رجسٹر رکھے ڈاڑھی کھجا کھجا کر من گھڑت قصے لکھتے لکھتے گھنٹوں کے لئے غائب ہو جاتا ہوں۔ یاد، یاد، بچپن اور جوانی کی یاد۔ گذشتہ زندگی کے نقشے پھر سے کھنچتے ہیں۔ اور اسی سینما کو دیکھتے دیکھتے چونک پڑتا ہوں۔ کھٹیا پر بیٹھا ہوں۔ حیرت کا قصہ لکھ رہا ہوں۔ بڑھی بندریا کا بیان ہے تو اے بندریا، بڈھی بندریا تو خوش قسمت ہے۔ بڑھاپے کے تھکے ہوئے ہاتھ پیر، دھندلی آنکھیں کُمھلایا ہوا دل، تجھ کو اس حالت میں گھنٹوں بٹھاتا ہے تو بٹھائے۔ تیرا دماغ یادِ ماضی سے پاک اور فکرِ فردا سے مستغنی ہے۔

بے شک تو خوش قسمت ہے اور میں بدنصیب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چند پیسوں کی اُجرت کے واسطے لکھ رہا ہوں کہ بندر بندریا کو ساتھ لئے ہوئے بندروں کے اس قافلہ میں داخل ہوا۔ فوراً ایک ہل چل سی مچ گئی۔ جو درخت پر تھے نیچے آ گئے۔ جو نیچے تھے اوپر چڑھ گئے۔ خو خیانے اور قو قو چلانے میں دو متضاد جذبے، نفرت اور محبت کے اظہار ہر طرف سے ہوئے اختلاف رائے کی وجہ سے کئی جگہ جنگ چھڑ گئی۔ بچے گودوں میں چھپا لئے گئے۔ لیکن جس قدر جلد یہ بدامنی

پہیلی تھی اتنے ہی جلد پھر امن اور سکون ہو گیا اور بندریا اپنی ٹولی میں باقاعدہ داخل ہو کر اس ٹولی کا ایک جزو بن گئی۔

اس ٹولی نے اس دن شام تک اسی درخت کی برگدیاں کھائیں، نالے کا پانی پیا اور رات کو یہیں قیام کیا۔ اور دوسرے دن صبح کوچ بول دیا۔ سڑک کو چھوڑ شمال مغرب میں سب سے قریب نظر آتے ہوئے پہاڑ کے دامن کی طرف بندر لوگ چل دیئے۔ پھل پھول کھاتے۔ گھونسلے اجاڑتے، ڈالیاں توڑتے اُچکتے، لڑتے بھڑتے خوخیاتے، چلّاتے، روز بروز پہاڑ کے اوپر ہی چڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دس دن کے بعد پانچ ہزار فٹ اوپر پہنچ کر نینی تال کی سڑک پر میل ۱۸ اور میل ۱۹ کے درمیان اخروٹ کے درختوں میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اتنی اونچائی کی آب و ہوا بندروں کو ہرگز خوشگوار نہ تھی۔ اتفاقاً یہاں تک آگئے تھے۔ اور غالباً آتے ہی واپس لوٹ جاتے۔ لیکن کچے اخروٹوں اور نیلی مکوئیوں کی لذت اُن کو چند روز یہاں روکے رہی۔

بارش پہاڑوں کی چوٹی پر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ گاہ بگاہ ہلکے چھینٹے پڑتے رہتے تھے۔ اس واسطے ابھی سردی بھی خوشگوار تھی۔ دن تو بہت ہی پُر لطف تھے۔ البتہ راتوں کو بندروں کے واسطے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کبھی کبھی تکلیف دہ ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ لوگ سُکڑ سُکڑا کوں کوں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے اس قدر چمٹ کر بیٹھ جاتے تھے کہ کافی بچاؤ سا ہو جاتا تھا اور اسی طرح صبح ہو جاتی تھی۔ پھر صبح ہوتے ہی سورج کی گرم کرنوں میں رات کی تکلیفیں بھول کر پُر فضا پہاڑوں کی سیر و تفریح میں لگ جاتے تھے۔ اس مست کن آب و ہوا نے بندروں کو جو بہت ہی زندہ دل ہوتے ہیں اور بھی زیادہ زندہ دل کر دیا تھا۔ ہر ایک خوش و خرم تھا۔ ہر ایک کے دل میں شرارتوں کی گدگدیاں رہ رہ کے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ بڑھیا میں بھی زندگی کی ہلکی سی لہر پیدا

ہو گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی کسی ڈھال پر بیٹھے بیٹھے ایک آدھ پتھر لڑھکا کر اس کا دُور تک لڑھکتا چلا جانا اور لڑھکنے میں متعدد اور چھوٹے بڑے پتھروں کا اپنے ساتھ شریک کر لینا دیکھا کرتی تھی۔

ادھر ہماری بندریا کا نوزائیدہ بچہ جس کو میں نے کنویں اور سڑک پر گھنٹوں ایک ہی تھن منہ میں دبائے بے حس سینے سے چمٹا دیکھا تھا۔ پہلے پہلے تو کچھ ہوشیار سا ہو گیا اور اب تو ماں کی گود سے اُتر کر کچھ کچھ اُچکنے اور کچھ کچھ پھُدکنے بھی لگا ہے۔ لیکن ہے ابھی بہت چھوٹا۔ ہر عضو تناسب سے الگ ہے۔ بہت بڑا سر۔ ذرا سا پنڈخی ایسا پیٹ، اس میں چار ہاتھ پیر ایک دُم۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ سینٹے لگے ہوئے ہیں۔ جھریوں دار لال لال منہ، سرمہ دار آنکھیں، سر پر مانگ نکلی ہوئی۔ ایک دفعہ دودھ پیتے پیتے ماں کی گود سے کُود کر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے۔ ماں جو کہ سڑک کی نالی سے تین فٹ دور بڑے سے پتھر کے نیچے بیٹھی اس کی جڑ میں سے تپستیا چٹر پٹے کے پتے نوچ نوچ کر کھا رہی ہے، بغیر رُخ بدلے دوسرا ہاتھ بڑھا کر بچے کی دُم پکڑ کر پھر اُسے اپنے قریب کھینچ لیتی ہے۔ بڑی دیر سے یہی ہو رہا ہے۔ بندریا کی پشت کی طرف ڈھال اور ڈھال پر کے پیڑ اور جھاڑیوں پر بڑی دور تک بندر پھیلے ہوئے پُر امن مشغلوں اور کھیلوں میں مصروف ہیں۔ اُن میں سے ایک سیانا بچہ کئی دفعہ بندریا کے پاس آکر اُس کے بچے کو اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے بہکا کر لے جانے کی کوشش کر چکا ہے اور آخری مرتبہ کی اس حرکت پر بندریا نے کئی بھپکیاں دے کر اُسے ذرا دھمکا بھی دیا ہے۔ مگر یہ کب مانتا ہے۔ پھر چپکے چپکے بندریا کی پیٹھ کے پیچھے بڑھ رہا ہے۔ مُنا بچہ دو پیروں پر کھڑا اماں کے کندھے پر سے اُس آوارہ چھوکرے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ دوستی کرنے کو دل چاہ رہا ہے ماں کے کندھے پر چڑھنے کو اُچکتا ہے۔ اور ناکامیابی کی وجہ سے بغل کے نیچے سے نکل کر چھوٹی چھوٹی پھُدکیاں لیتا ہوا بندر کے لونڈے کی طرف بڑھتا ہے۔ ماں چٹر پٹا نوچتے نوچتے

گود خالی پا کر ایک دفعہ گھوم پڑتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ وہی بدمعاش کھڑا بچے کو پھسلا رہا ہے۔ غصہ آگیا۔ اُس کے پیچھے لپک ہی تو پڑی۔ لیکن ایک اور صرف ایک ہی گز بچے سے آگے ہوئی تھی کہ وہ وہیں رُک گئی۔ بچے کی طرف سر گھما ہی رہی تھی کہ " دناں ناناں دَن دَن " اوہ، یہ کیا ہوا۔ کان کے پردے پھٹ گئے۔ دل دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ۔ دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اُچک پتھر پر، وہاں سے اچک درخت پر، اور پھر اُچک اور اُوپر۔ بندریا بچے کو چھوڑ درخت کی پھننگ پر تھی۔ باقی بندر جہاں کے تہاں تتر بتر بھاگ رہے تھے۔ زن سے ایک آدمی بڑے پتھر کی آڑ میں سے نکل بچے کے پاس آیا۔ بچہ زمین پر اوندھا پڑا۔ کھیسیں نکالے کِچ کِچ، کِچ کِچ کر رہا تھا۔ بندریا درخت سے پتھر پر کودی۔ احمد نے دو فیر بارہ بور کے اور کئے۔ دَن دَن۔ بندریا پتھر سے درخت پر اور درخت سے پتھر پر کودنے لگی۔ دُوجغادریوں نے کبھی ادھر لپکتے ہوئے اور بھی ڈر کر بھاگتے ہوئے خَو، خَو، قوق، خو کی پُروحشت صدائیں نکالیں۔

بندروں کا پورا قبیلہ خُوخُو، قوق، خُوخُو چلّانے لگا۔ ادھر احمد نے جھک کر بچے کو اٹھایا۔ اُدھر ساں سے پھسلتا ہوا زرد موٹر پتھر کے پاس آ کر رُک گیا۔ ان سب واقعات میں ابھی دس سکنڈ بھی نہ لگے ہوں گے کہ احمد بچہ دبائے موٹر میں کودا۔ اور قریشی صاحب جو اب خود ڈرائیور کر رہے تھے اُسے لے کر سنسناتے ہوئے چل دیئے۔ اب بندر ہزار دوڑ دھوپ کریں کیا ہوتا ہے۔ بیسیوں موٹر کے تعاقب میں خوخیاتے دوڑے، لیکن وہاں کیا تھا سڑک خالی پڑی تھی۔ موٹر کا دھواں تک نہ تھا۔ بندریا ان بوکھلائے ہوئے بندروں میں ہر ایک کے آگے خُوخُو کرتی ہوئی، ناچی ناچی پھرنے لگی۔ ہر ایک بندر خود بھی کان نیچے تانے، بھنویں چڑھائے گردن اور پیٹھ پر کے بال کھڑے کئے خُوخُو کر کے بندریا کو جواب دینے لگے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک اُس سے کہہ رہا ہے " اے بُوا تم نے ہی کچھ کر لیا ہوتا "۔

بُوا نے بار بار ہر ایک کو خوخیا اور قی قیا کے بدن کو جھٹکے دے کر پیٹھ کے بال کھڑے کر کے بہادری پر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر سب بے سود رہا اور جب کچھ اور ہوتا نظر نہ آیا تو خو خو، قی قی، خوخو کرتی ہوئی تیزی سے اُدھر دوڑی چلی گئی جدھر موٹر گیا تھا۔ کچھ نوجوانوں نے تھوڑی دور اُس کا ساتھ دیا۔ لیکن پھر وہ بھی لوٹ آئے۔

تپتے میدانوں اور گرد اُڑتی سڑکوں سے بھاگتی موٹر اور اچکتے خوخیا تے بندروں سے پڑھنے والوں کا دماغ پریشان ہو گیا ہو گا۔ اس لئے ہم ایک پُر امن، پر سکون، پُر عیش، پُر فضا، پُر وضع، پُر تکلف مکان، کرسیوں، میزوں کوچوں، صوفوں، دریوں، قالینوں، اوٹوں، پردوں، تصویروں، آئینوں، گلدانوں، گملوں، پھولوں اور خوشبوؤں سے پُر پیش کرتے ہیں۔

قریشی صاحب کا مکان، فردوس کاٹیج، ان عمارتوں میں سے نہیں ہے جو کہ شاہراہِ عام پر کھڑی اپنی شان و شوکت کی نمائش سر بازار کرتی ہیں۔ بلکہ اُن چند ہستیوں کی طرح جن کو دولت کی زیادتی خود آرائی اور خود ستائش سے بھی بالاتر کر دیتی ہے۔ یہ زبردست کوٹھی بھی کاٹیج (چھپریا) کا تخلص اختیار کئے شہر سے میلوں دُور، سڑک سے ایک طرف چیڑھ کے درختوں میں چھُپی کھڑی ہے گویا کہ شہر اور سڑک سے اس کی ہستی کسی طرح زیر بارِ احسان نہیں۔ یہ خود اپنی تمام ضرورتیں آپ پوری کر سکتی ہے اور واقعہ بھی یہ ہے اُس کے گیرج میں قریشی صاحب کی سیدھی سادی بیوک اور بیگم صاحبہ کی رولز کے علاوہ دو بازاری فورڈیں آبلے جابلے لونڈے کے احکام کی منتظر معمولی ضرورتوں کے واسطے نینی تال، کاٹھ گودام اور بریلی دوڑ بھاگنے کو تیار رہتی ہیں۔ کوٹھی کے احاطہ میں سیب ناشپاتی، آلوچے اور خوبانیوں کے درخت پھولوں سے لدے، چکنے سمنٹ کے ٹینس کورٹ کے گرد کھڑے آرائش کی نازک خیالوں میں مصروف نظر آتے

ہیں۔ ہر طرف گملوں، پودوں، جھاڑیوں، درختوں اور بیلوں میں پھول رنگ و بُو میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ پسِ پُشت بہادہ ترکاریوں کا تختہ دور افتادہ مؤدب شاگرد پیشہ سے اپنی مرٹر پھلیاں اور ٹماٹر وغیرہ لٹکا لٹکا کر دل لگیاں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا اپنی ہمہ گرد و پیش کوٹھی نے اب یہی سادگی کا ایک جامہ پہن رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں کوٹھی بھی خوشنمائی کی کوشش کرتی نظر نہیں آتی۔ قیمتی لال ٹائلوں کی ہر طرف سے ڈھلواں چھت سے ڈھکا ہوا ایک ڈھیر سا ہے۔ جس کو قریب قریب ہر طرف سے شیشوں دار کھڑکیوں اور شیشے دار کٹہروں نے گھیر رکھا ہے اور اس ہی سے ہفت پہل اور ہشت پہل شیشوں دار کھڑکیاں آگے کو نکلی ہوئی پھول دار بیلوں کے آنچل سر پر ڈالے جھانک رہی ہیں۔

چھوٹے سے پورچ نما برامدہ میں جس کو بیلوں اور لٹکے ہوئے گملوں نے فرن ہاؤس سا بنا رکھا ہے۔ دھوئے سفید رنگ کی نازک خیال، نازک طبع، خفیف الجثہ فردوس بانو بیٹھی نزاکت سے موٹی موٹی ڈکشنری اٹھا کر السٹریٹیڈ ویکلی کا معمہ حل کر رہی ہیں۔ ان کے سیدھے ہاتھ پر ٹیلی فون سے کچھ دُور نیچی تپائی پر ہلکا آسمانی جمپر سیتی ہوئی قریشی صاحب کی بیوہ بہن ٹیلیفون اور بھاوج دونوں سے خوفزدہ سی بیٹھی ہیں۔ برآمدہ کے وسط میں خاموش سفید پوش ملازم بغیر پیروں کی آہٹ کے سامان لا کر شام کی چائے کے واسطے میز سجا رہا ہے۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر دو مائیں یا دو ساسیں گو ایک ہی کوچ پر بیٹھی ہیں۔ لیکن ہر طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

سفید رنگ، سادہ پوش، سفید بال، دُبلی پتلی، بے وجہ ہنسنے والی عقل سے خارج، ہر چیز بہ قانع، ہر چیز سے خوش، یہ فردوس بانوں کی ماں یا قریشی صاحب کی ساس ہیں۔ چاہیں تو خود مختار گھر کی مالک ہیں۔ لیکن نہ اپنے اختیارات سے واقف ہیں، نہ اختیار برتنے کی خواہش ہی ہے۔

دوسری موٹی بھدی، زیورات سے آراستہ، رنگین کپڑوں کا پلندہ، کھچڑی سر،

سُرمگیں آنکھیں، بھویں تنی، منہ ٹیڑھا۔ قریشی صاحب کی ماں اور اس لئے فردوس بانو کی ساس ہیں۔ خود مہمان طریق آئی ہیں۔ مالکانہ اختیارات ہر ہر لمحہ برتنے کے موقعے دیکھتی رہتی ہیں۔ احکامات جاری کرتی ہیں اور جب اکثر اُن پر عملدر آمد نہیں ہوتے تو گھٹتی اور کڑھتی رہتی ہیں۔ اُن کو ہر ایک سرکشی پر آمادہ اور اُن سے خلاف نظر آتا ہے۔ میاں کی زندگی میں سب راج راج چکی ہیں۔ اور گو وہ اور اُن کے ساتھ دولت دونوں اُن سے جُدا ہو گئے ہیں۔ لیکن طبیعت کی رعونت وہی باقی ہے اس وقت بھی مدراسی "آیا کو" جو کہ اُن کے پاس برآمدے کے کنارے بچے کی جھلواں مسہری ہلا رہی ہے۔ بُری نظروں سے گھور رہی ہیں۔ کیونکہ اُس کو حکم دیا تھا کہ سردی ہو رہی ہے، بچے کو باہر نہ لائے۔ اور وہ اپنے علم آگہی کو زور دیتی ہوئی بچے کو ہوا خوری کے واسطے باہر لے آئی ہے اور برابر دہرا رہی ہے۔ "بابا لوگ کا کام ہم سے جادہ بی بی تم نہیں جانتا۔ ہم کوئی نیا نئی ہے۔ ہم بڑا میم لوگ پاس کام کیا ہے۔ بی بی تم نئی جانتا۔"

بی بی بھی ایکساں بُڑ بُڑا رہی ہیں۔ "اے چل! تیری صورت کو جھلسا۔ مُوئی چمریہ چلی مجھ سے زبان درازی کرنے۔ بنی ہے بڑی میم کی بچی۔"

بیوہ لڑکی سے آخر نہ رہا گیا اور جز بز ہو کر کہا۔ اماں چپ بھی ہو جایئے اور پھر بھاوج کی طرف مخاطب ہوئیں۔ "اے دُولہن دیکھو تو ٹھیک ہے نا!"

فردوس بانو:۔ (ذرا بگڑ کر) باجی۔ دُلہن، دُلہن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کو کئی مرتبہ منع کیا۔ آخر آپ میرا نام کیوں نہیں لیتیں۔

کلثوم:۔ (یعنی نند۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہوگا۔ منہ سے نکل گیا۔ دیکھو تنگ تو نہیں ہو گیا۔

فردوس بانو نے جمپر لے کر دیکھا۔ نہ تعریف کی نہ مُنہ بنایا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔" کہتے ہوئے واپس کر دیا۔ اتنے میں موٹر آ گیا۔ قریشی صاحب نے اُترتے ہی احمد کے ہاتھ سے بندریا کا بچہ لے لیا اور اُسے لئے ہوئے بڑے زور سے آگے بڑھے۔

"لیجئے بیگم" کہتے ہوئے بچہ کو جو دونوں ہاتھوں سے کوٹ پکڑے بغل میں گھسا جاتا تھا کھینچ کر آگے بڑھا دیا۔ بچہ دانت نکالے تیں تیں کرتا۔ دُہائی دینے لگا۔ بیگم صاحب اخبار پھینک ساری سنبھالتی ہوئی ہال کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ "بھئی اُدھر ہی رہنے دو اُدھر ہی رکھو" کہتی ہوئی بڑھیں۔ اندر چھپ جانے اور باہر آجانے کے نہ طے ہونے والے فیصلے میں پڑ کر وہیں رک گئیں۔

بڑی بیگم یا قریشی صاحب کی والدہ بولیں" اچھا کیا میاں جو لے آئے۔ میں تو کئی دفعہ کہہ چکی تھی کہ بچے کے پاس بندر کی ہوا ہونے سے الا بلا بیماریاں پاس نہیں آتیں۔"

قریشی صاحب :۔ بی اماں آپ نے بھی کئی دفعہ کہا تھا اور احمد نے بھی مجھ سے کہا کہ بندر پاس رکھنے سے ہوا صاف رہتی ہے۔ دیکھئے آج میں لے ہی آیا۔

یہ کہتے ہوئے بندر کو پھر بیوی کی طرف بڑھایا۔ بیوی کی طرف بڑھایا۔ بیوی نے پھر کمرے میں گھس جانے کے آثار ظاہر کئے۔

"امی (یعنی قریشی صاحب کی ساس) بچے کے پاس لے جاؤ۔ میاں دیکھو کیا کرتا ہے۔"

آیا۔ (جلدی سے بچے کے سامنے آکر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر) اوہ نئی۔ نئی بابا لوگ ڈر جائے گا۔ بابا لوگ کے کاٹ لے گا۔

بی اماں۔ چل چڑیل۔ بڑی آئی۔ اماں بنتی ہے۔

فردوس بانو:۔ اے واہ بی اماں، اور کیا، ڈر تو جائے گا (میاں سے) بھئی ایسے نہیں، بس دُور ہی رکھو۔ دُور سے ہوا کیا نہیں لگے گی!"

فردوس بانو اور شاید قریشی صاحب ایک منٹ کے واسطے بھی بندر کی موجودگی بچے کے پاس تو درکنار اپنے گھر میں بھی گوارا نہ کرتے لیکن شادی سے آٹھ برس بعد اللہ نے لڑکا دیا ہے۔ ہزاروں منتوں مرادوں کا بچہ اور پھر وہ بھی نہایت کمزور دُبلا پتلا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سوکھے کی بیماری ساتھ ہی لئے پیدا ہوا ہے۔ ماں اور باپ

دونوں اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں۔ گو ابھی ڈیڑھ مہینے کا ہے لیکن درجنوں، کوڑیوں طرح طرح کے کھلونے اُس کے واسطے آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر ہر تیسرے روز اُسے آ کر دیکھتا ہے۔ کوئی کچھ بھی لڑکے کے فائدے کی بات بتا دے، ماں اور باپ دونوں روشن خیالی کو بالائے طاق رکھ کر جہالت اور توہم پرستی کے کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے بندر کا بچہ انسانوں کے گھر میں آیا ہے۔ دیکھئے کس کروٹ یہ اونٹ بیٹھتا ہے۔

تیسرا باب

بچے نے آتے ہی ہوا صاف کرنے کے بجائے گندگی پھیلانا شروع کر دی۔ دُودھ جب دیا جائے پیالے میں ہاتھ ڈال دے اور انگلیوں میں سے ٹپکتی ہوئی بوندیں چاٹنے کی کوشش کرے۔ سخت چیز کھا نہیں سکتا تھا۔ نرم چیزیں مثلاً گُھلے ہوئے کیلے اور کھچڑی اور کھیر، کھائے تو کم اور چاروں طرف لیسے زیادہ۔ ہر ایک، اس کے لئے غذائیں، بیٹھنے کی جگہ اور مہذب بنانے کے طریقے دُور ہی سے تجویز کرنے لگا اور بیچاری نند کو اُن کی آیا گیری اس طرح سپرد ہو گئی کہ گویا یہ اُن کا ہمیشہ کا ہی کام تھا۔ بیوہ نند نے جس طرح مغلانی وغیرہ کے اور کام بھی بغیر عذر کئے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنے ذمہ لے رکھے تھے یہ کام بھی لے لیا۔ اور کئی دن کی الٹا پلٹی کے بعد صاحبزادے کے لئے ایک بڑی سی دُودھ کی بوتل میں نپل لگا کر اُن کے دودھ پینے کا مسئلہ حل کیا۔ ایک چھوٹا سا کھٹولا بھی اُن کے واسطے منگوا دیا گیا تھا۔ جس پر کہ یہ دودھ پیتے وقت تو ضرور بوتل کے ساتھ لیٹ جاتے تھے۔ لیکن اس وقت کے علاوہ سوائے رفع حاجت کرنے کے بستر کو کسی اور مصرف کا نہ سمجھتے تھے۔ ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ کسی کرسی پر چڑھ کر اس کے ڈنڈوں پر آرام کیا جائے۔

آخر کار سب نے ہار کر ان کو کمروں کے اندر سے نکال لڑکے کے کمرے سے ملے برآمدے میں رکھنے کی جگہ منتخب کی۔ وہاں کٹہرے پر چڑھ کر اس کے ڈنڈے پر اُن کو بھی آرام ملا۔ گو یہاں کالی کلوٹی مدارسی آیا آتے اور جاتے ان کے ٹہیپیں لگاتی رہتی تھی۔ تاہم کُھلی ہوا تو تھی سامنے کے درخت اور درختوں کے پیچھے پہاڑ تو نظر آتے تھے۔ یہ گھنٹوں بیٹھا۔ پیٹھ اور کمر کھجا کر اس نظارہ کو دیکھا کرتا تھا۔

پہاڑ پر کے ان ہی درختوں میں سے ایک روز اس کی ماں نکلی۔ درختوں سے کود ٹماٹروں میں سے ڈبکی ڈبکی چل کر تین چھلانگوں میں کٹہرے پر آ، اُسے سینے سے چمٹالیا۔ بچھڑے مل گئے۔ ماں کے کلیجے سے بچہ چمٹ گیا۔ زبانیں خاموش رہیں، دل سے دل مل گئے۔ نہ اُس نے دنوں اور راتوں کو اُو اُو کرتے پہاڑوں پہاڑوں مارے مارے پھرنے کی داستان سنائی۔ نہ اُس نے رُو رُو کر دُودھ نہ پینے پر مار کھانے کھٹولے پر نہ لیٹنے پر مار کھانے، کھیر لیستے پر مار کھانے، کرتہ نہ پہننے پر مار کھانے، ہگنے موتنے پر مار کھانے کے بیان کئے۔ بس ہوا تو اتنا ہی دھڑکتے ہوئے دو دل مل گئے۔ دودھ پیتے ہوئے بچے کی اوپر اور دودھ پلاتی ہوئی ماں کی آنکھیں نیچے، ایک دوسرے کی روحوں میں جذب ہونے لگیں۔ شام کی روشنی میں۔ چھائے ہوئے ہلکے بادلوں کے سائے میں سوئے سبزے پر بجلی کا کوندا ہوا۔ بچہ چھاتی سے اور چمٹ گیا۔ ماں نے ہاتھ سے اور چمٹا لیا۔ شام ہو رہی تھی۔ موقع مخدوش تھا۔ بسیرے کا وقت آگیا تھا۔ بندریا نے درختوں کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ جنگلے سے نیچے بھی نہ اُتر سکی تھی کہ کی کی، کی کی کرتا ہوا بچہ سینے سے الگ کھنچ گیا۔ وہ پھر کٹہرے پر چڑھی بچے کو سینے میں دبایا اور پھر اُترنے لگی۔ لیکن بچہ پھر کی کی چلایا اور اُس نے کمر پر بندھی رسی ہاتھ سے پکڑلی (آہ بچہ بندھا ہوا ہے) ماں پھر نیچے اُتری رسی نے بچے کو پھر کھینچ لیا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بجلی چمکی، بادل گرجا اور گرج پہاڑوں میں گونجنے لگی۔ شام شام بسیرا، گھنے درخت سامنے تھے۔ سر پر بادل چھایا تھا۔ بندریا اور بچے دونوں نے رسی کو کھینچا اور پھر کھینچا، برآمدہ کے اندر اترے، رسی تانے تانے ایک چکر کھایا اور کٹہرے پر چڑھ کر بچے کو چمٹا روانہ ہوئی۔ رسی اب بھی موجود تھی، وہ تن گئی یہ کلکلایا اور کھنچ گیا۔ بڑھتے اندھیرے میں گڑگڑاتے بادلوں میں مامتا کی ماری دیوانی بندریا کھمبے کے گرد گھومی۔ کٹہرے کے جال میں سے نکلی۔ مگر آہ، رسی سے نجات نہ ملی۔ بلکہ رسی اور چاروں طرف سے اُلجھ کر تن گئی۔ اب ہلنا جلنا مشکل

ہو گیا۔ بچے کی کمر کٹنے لگی اور وہ بُری طرح چلّانے لگا۔ بندریا کے دل پر وحشت تھی، دہشت تھی، خوف تھا، ہراس تھا، پریشانی تھی، حیرانی تھی، اضطراب تھا، یاس تھی۔ بے کسی تھی اور محبت کی آگ لگی تھی۔ اندھیرا چھا چکا تھا، بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اسی حالت میں جھک سے ہو گیا۔ وحشت زدہ بندریا 'خی' سے چلّا کر اچھل پڑی۔ کسی نے سوئچ لگا دیا۔ بجلی کے تیس لیمپوں سے برآمدہ دن کی طرح جگمگایا۔ ماں کے ڈر کے زور سے اُچھلنے سے بچے کی کمر میں رسّی نے بلا کا جھٹکا دیا۔ وہ کی کی، خی خی چلّا رہا تھا۔ اور کمرے کے دروازے میں مدراسی آیا۔ "آئی، آئی آئی۔" مونگ کی۔۔۔ آئی آئی مونگ کی" (منکی MONKEY)

بے وفا اقبال و ثروت کی بھرنہ ملنے والی تصوری مورتیوں کی پُجارن، قریشی صاحب کی ماں، آیا پر بگڑتی، لڑکی کو جھڑکتی، بہو پر کلستی دوڑیں۔

دسترس سے باہر اقبال و ثروت کی خوشہ چیں۔ قریشی صاحب کی بہن آیا سے جھینپتی، ماں سے دبتی، بھاوج سے ڈرتی دوڑیں۔

سر چڑھے اقبال و ثروت کے نشے سے مخمور قریشی صاحب کی بیوی آیا کو گھُرکتی، نند کا آنچل کھینچتی، ساس پر بگڑتی دوڑیں۔

اور اقبال و ثروت کی روشن خیالیوں سے نا آشنا۔ سیدھی سادی، قریشی صاحب کی ساس بھی ہنستی ہوئی ہر ایک سے راضی سب سے پیچھے آکر کھڑی ہو گئیں۔

بندریا بھبکیاں دیتی ہوئی برابر پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ملازم دوڑے آئے اور وہ آخری بھبکی دے کر اخروٹ کے درخت پر چھلانگ مار کر درختوں، درختوں جنگل کو چلدی۔ اور رات کے اندھیرے میں جبکہ وہ ٹھنڈی ہوا اور بوندوں میں درخت پر دبکی بیٹھی تھی۔ یہاں فردوس کاٹج میں ریڈی ایٹر کی گرم شعاعوں میں اور شیڈ دار لیمپوں کی چھنی ہوئی روشنی میں کھانا ہونے لگا۔ میز کے گرد قریشی صاحب اُن کی بیوی، ساس ماں اور بہن بیٹھ گئیں۔ ایک اسٹول پر آیا بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ دروازے کے پاس بند الماری کی کنڈی میں رسی باندھ کر بندریا کے بچے کو جگہ دی گئی، اور

ہنسی اور باتوں کے ساتھ کھانا ہونے لگا۔ آیا بولتی تھی، صاحب ہنستے تھے۔ غرضیکہ باتیں، مذاق، ہنسیاں، ہلکے ہلکے طعنے، جھڑکیاں اور پھر مذاق، پھر ہنسیاں بھی جاری تھیں۔ اور جب یہ جاری تھا تو بندر کے بچے کا رسی کی حد میں چائیں، مائیں، چائیں مائیں۔ یکساں چکّر لگانا بھی جاری تھا۔

بہت دیر کے بعد جب کہ کھانا بھی ختم ہو چکا تھا۔ ریڈیو بھی بول چکا تھا جبکہ بندر کا بچہ خالی غسل خانہ میں بند کر دیا گیا تھا۔ جبکہ گھر والے اپنے اپنے کمروں میں اور ملازم اپنی اپنی کوٹھریوں میں نیند سے بے ہوش ہو چکے تھے۔ قریشی صاحب نے اپنے نرم گرم ریشم اور اون کے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے دور دو آوازیں سنیں پہلے بندریا کی آواز تھی جس کو کہ بیچ بسیرا ممتا نے بے قرار کر دیا تھا۔ وہ اُو اُو پکارتی درختوں درختوں پھر رہی تھی۔ اور دوسری، بہت دور، دو ہزار فیٹ نیچے بیر بھٹی کے قریب کسی نامعلوم شخص کی زوردار آواز تھی۔ جو کہ چلایا NOW THEN MY LORD

اور پہاڑوں نے بتدریج گھٹتی ہوئی آوازوں میں جواب دیئے۔

NOW THEN MY LORD NOW THEN MY LORD

اندھیری رات، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور بارش کے خیال سے قریشی صاحب کے بدن میں پھریری آگئی۔ وہ گرم ریشمی لحاف میں دبکے اور سو گئے۔

دوسرے دن پھر بندریا کوٹھی میں دیکھی گئی اور تیسرے اور چوتھے اور پانچویں دن پھر کبھی بچے کے پاس، کبھی بچے کو دودھ پلاتے۔ لوگوں نے دیکھا۔ پتھر مارے غل مچایا اور بھگا دیا۔ لیکن آخر میں یہی رائے قائم ہوئی کہ آتی ہے آنے دو، بچے کو دودھ پلاتی ہے، اپنا کیا لیتی ہے۔ اس طرح بندریا دن میں کئی مرتبہ آکر بچے کو دودھ پلا جاتی تھی۔ اب اس کے واسطے یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس کی ٹولی پہلی ہی بارش پر ہر طرح اس کو ساتھ لے چلنے کی کوشش کرنے کے بعد اُسے اکیلا چھوڑ کر پہاڑوں سے نیچے کوچ کر گئی تھی۔ اب اکیلی بندریا درختوں پر تنہا

اچھل کود کر پھل پات سے پیٹ بھرتی اور دن میں دو ایک مرتبہ بچے کو دودھ پلا جاتی تھی۔ اسی دوران میں ایک دفعہ بچے کے پاس روٹی کے ٹکڑے اور پھل پڑے ہوئے بندریا کو ملے۔ جو کہ اس نے کھالئے۔ پھر ایک دفعہ جب یہ دودھ پلا رہی تھی ایک عورت نے برابر کے دروازے میں سے آدھے دھڑ سے باہر نکل اُس کی طرف روٹی کے ٹکڑے پھینکے۔ پہلے تو یہ ڈر گئی، بچے کو چھوڑ، جنگلے سے کود، دو گز پرے کھڑے ہوکر، کان پیچھے کو تان، ہونٹ سکیڑ، دہانے کو گول دائرہ بنا، خوخو کی بھبکی دی۔ مگر دو پیروں پر کھڑے ہوکر دیکھا تو روٹی تھی۔ پھر کٹہرے پر آ بیٹھی اور مزید احتیاط کے واسطے کان سکیڑ۔ سر کو جھٹکا دے۔ بھبکیوں پر بھبکیاں دیں۔ جب دشمن کا احتمال نہ رہا۔ دوستی کے ارادوں کا یقین ہو گیا تو نیچے کود روٹی کھانے لگی۔ اس دن سے اکثر اُس کو کھانے کی چیزیں ملنے لگیں۔ دو چار دن بعد بارش نے پورا زور پکڑ لیا۔ سخت سردی پڑنے لگی، پہاڑوں پر کہرا چھا گیا۔

بندریا کو کچھ تو غذا مل ہی جاتی تھی۔ اب اُس نے بھی کوٹھی کا دامن پکڑ لیا۔ یہاں سردی اور پانی سے بچاؤ تھا۔ باغ میں پھل، کیاریوں میں ترکاریوں تھیں۔ بچہ پاس تھا۔ ایک طرح پر یہیں رہنے لگی اور فطرت کا تقاضا۔ پھل پھول ترکاریاں، کھانے، نوچنے اور برباد کرنے لگی اور جب اس طرح سے سیری ہو جائے تو گھر کا بھی جائزہ لے۔ کبھی گلدان گرائے، گملے لڑھکائے، کبھی پردے اور ہال میں سے کشن اٹھا لائے۔ ان سب پر اضافہ یہ ہوا کہ بچہ تو بندھا ہوا غلاظت کا چھڑ کاؤ رسی کے محدود دائرے ہی میں کیا کرتا تھا۔ اور یہ آزادی کی وجہ سے نجاست کی تخم ریزی بنگلے بھر میں کرتی پھرتی تھی۔ تواضع شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد لوگوں کا دل اُن سے بھر گیا اور اب طرح طرح سے اُس کو بھگا دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ بی اماں آیا پر، اور آیا بی اماں پر بندریا کی دوستی کا الزام لگانے لگیں۔ فردوس بانو نند کو قصوروار ٹھہرا کر اُن پر کلسنے لگیں۔ نند بیچاری کھسیانی ہنسی ہنس کر چھوٹے چھوٹے نئے طریقوں سے خوشامد

کرنے لگی - فردوس بانو کی ماں اور بھی زیادہ دیوانے پن کا ثبوت دینے لگی۔

آخر کار جس دن ڈائننگ ٹیبل پر بندریا نے رفع حاجت کر کے سائڈ بورڈ کے اوپر قطار میں رکھے ہوئے پورٹ وائن گلاسوں کی جگہ صاف کی تو چھن چھن، چھناچھن کی آوازیں بالکل پسند نہ آئیں۔ احمد کو نادر شاہی حکم دے دیا گیا اور احمد صاحب ریشمی قمیص، شلوار اور تلے دار جوتہ پہنے، دو نالی بندوق اٹھائے اٹھائے، کوٹھی کے گرد پھر پھر کر چھت پر آنکھ مچولی کھیلتے بندریا کی گھات لگانے لگے۔ فردوس بانو کی سڑن ماں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ٹھونسے اول ہر ایک سے باری باری بندریا کے حق میں سفارشیں کیں۔ اور جب سب طرف سے مایوسی ہو گئی تو روتی ہوئی داماد کے حضور میں حاضر ہو کر رحم اور جاں بخشی کی التجا کی۔ بیٹا بندریا کا مارنا بُرا ہے۔ ہمارے یہاں تو راس ہی نہیں آتا۔ مجھے تو وہم آتا ہے۔ جیسے فردوس ابھی اس کا بچہ چھوٹا ہے۔ بیٹا، بندر نہ مارو، اس کا مارنا بہت بُرا ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بلائے گئے، ان کا بہادرانہ جوش ٹھنڈا کیا گیا۔ اور حکم دے دیا گیا کہ جان سے نہ مارا جائے، صرف ہوائی فیر کر کے ڈرا دیا جائے اور بندوق شاگرد پیشہ ہی میں رکھی رہے۔ جب یہ آئے اسے ڈرا کر بھگا دیا جائے بندریا کی بساط ہی کیا، بارہ بور کے دھڑاکوں سے اوسان خطا ہو گئے۔ دو ہی دن میں وحشت محبت پر حاوی ہو گئی۔ بندریا نے بنگلہ کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔

سخت سردی، سخت بارش، ٹھنڈی ہوا۔ کہرا، ٹپکتے ہوئے درخت بھیگی ہوئی گھانسیں، پہاڑوں کی کھوئیں اور کھڈ تھے اور تنہا بندریا تھی۔ اُس کی ٹولی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ بچہ اس کا جیتے جی چھٹ گیا تھا۔ موسم ہر طرح اُس کے خلاف تھا۔ غذائیں نئی تھیں اور کم تھیں۔ بندریا گھنٹوں کسی گیلے، اُگی ہوئی فرنوں کے سبز گدالے پر بھوکی بیٹھی، اپنے سے اوپر اور اپنے سے نیچے خاموش گھومتے ہوئے بادلوں کو دیکھا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ کہرا آ کر پھر سب قریب

جوار کو دھند میں غرق کر لیتا تھا۔ اور اس وقت بے بس بندریا جو نہ جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ دل پر چھائے غبار کو دھیمی، دبی اُو اُو، میں کھینچ کھینچ کے نکالتی تھی۔

یہ کیا ہوا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے
ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے

ادھر بندریا کے بچے کی یہ حالت کہ ماں سے مل کر چھٹنے کا صدمہ تھا۔ ہر وقت اُس کے پھر آجانے کا بے کلی سے انتظار تھا اور جب اُمید ناامیدی سے تبدیل ہونے لگتی تھی تو وہ بھی اُو، اُو کرتا تھا۔ اور یہ اُو، اُو پُر یاس، دلخراش اُو، اُو۔ دوپہر کے سناٹے میں، شام کی خاموشی میں، راتوں کی تاریکی میں، ہر وقت بچے کے سینے سے نکلتی تھی۔ گندگی گو کم ہو گئی تھی۔ اور مالی نقصانات بھی اب نہ ہوتے تھے لیکن صبح اُو اُو، شام اُو اُو، پھر رات اُو، اُو، ادھر پھر رات، اُدھر جب آنکھ کھلی تو اُو اُو، گھر کا گھر عاجز آچکا تھا۔

ایک دن چند احباب اور لیڈیز کی ٹی پارٹی کے وقت اس آواز نے بندریا اور بچے کے متعلق باتیں چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ "بندر کے سینے میں قید کی حالت میں بہت جلد دق کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بندر کو گھر میں کبھی نہیں رکھنا چاہیئے۔"

یہ سنتے ہی قریشی صاحب اور اُن کی بیوی دونوں گھبرا گئے۔ اسی وقت انہوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ کل ہی اس بچہ کو کہیں دُور چھڑوا دیں گے۔ لیکن مہمانوں میں شیلا نام کی ایک نازک اندام، نوعمر، کم پڑھی اور زیادہ روشن خیال، آریہ ورت تمدن اور نئی روشنی کے دو بُعد المشرقین سروں کو یکجا کر کے ایک ناممکن مرکب تیار کرنے کی کوشاں، بالکل ایسی لڑکی بھی موجود تھی۔ جیسے کہ اکثر نوجوان آجکل نظر آتے ہیں۔ اس نے بندر کے بچے کو لینے کی التجا کی جو کہ فوراً قبول کر لی گئی اور اس طرح حیوان کا بچہ فردوس کاٹج کی ذلیل زندگی سے نکل کر اوک لاج

میں خدائی کا درجہ حاصل کر کے رہنے لگا۔ کیونکہ گوبر دھن لال دوبے، آئی سی ایس کی پریجمال، نازک خیال، نازک بدن شیلا ہنومان مندر واقع تلی تال کے مست پجاریوں کی بیباک نگاہوں سے متنفر ہو کر جیتے جاگتے ہنومان کو پوجا کرنے کے واسطے ہی لے گئی تھی۔

خوبصورت، زبردست، عالی شان اوک لاج میں اعلیٰ انگلش مذاق کے مطابق نہایت قیمتی اشیا سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سائڈ روم اور پارلروں کے علاوہ ایسے بھی کمرے تھے جن میں نور سے گھرے ہوئے رشیوں اور دیوتاؤں کی تصویریں لال رنگ سے دیواروں پر بنالی گئی تھیں۔ جہاں کی دیواریں اور فرش لپے پُتے اور صاف تھے۔ جہاں منجھی ہوئی پیتل کی جھلملاتی بالٹیوں اور لٹیوں میں پانی دھلی ہوئی چوکیوں پر رکھا رہتا تھا۔ جہاں اشنان کئے، تلک لگائے، ننگے بدن، دھوتی اور جنیؤ پہنے گھر کے بزرگ، تپ اور جپ کرتے دھیان اور گیان میں لگے رہتے تھے۔ جہاں ستھری تھالیوں میں سیندور، صندل، تلسی، ناریل وغیرہ پوجا کے لئے مہیا رہتے تھے۔ کمرے، جن کے برآمدے کے اندر اور باہر مہین سفید دھوتیاں لمبائی میں پھیلی ہوا میں سرسراتی نظر آتی تھیں۔ جہاں دُودھ پی لینے سے گندے ہو جانے والے گلاس اور کھانا کھا لینے سے انتہائی ناپاک ہو جانے والے برتن، استعمال کے بعد لڑھکا دیئے جاتے تھے۔ جہاں کُتّا ان کو اس وقت تک چاٹتا تھا جب تک کہ بہت سے جمع ہو جانے کے بعد ایک دفعہ پھر کہار آکر اُن کو مٹی گوبر سے صاف نہ کرے۔ اسی برآمدہ سے ملی ایک کوٹھری میں، دیوار سے ملی ایک کیل گاڑی گئی۔ زمین گوبر سے لیپی گئی۔ تعلیم یافتہ، روشن خیال، فیشن کی دلدادہ دھرم کی پکّی۔ جدت پسند، ترقی کی حامی، لیڈر منش، ہنومان بھگت، سندر دیوی شیلا اشنان کئے، تر بال بکھیرے، اٹھتی جوانی کو اکیلی ریشمی ساڑھی میں لپیٹے۔ ایک ہاتھ میں لٹیا لٹکائے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر پوجا کے سامان سے بھری تھالی رکھے ہنومان جی کی پوجا کو آئی۔ بندر کا بچّہ پیتل کی ایک

طشتری، جس میں اُس کو کھانے کو کچھ دیا گیا تھا دونوں ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھے زور کر رہا تھا۔ فوراً شیلاؔ دیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ چھن چھنا نا نا۔ سر سے تھالی گری۔ لڑھکی اور چھن چھنائی۔ بندر ہمہ تن گوش شیلاؔ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ہاتھ کے بجائے پیر سے تھالی کو پکڑ ہلانے جلانے لگا۔ شیلاؔ عقیدت سے پُر، مطمئن، مؤدب سامنے بیٹھی پوجا میں مصروف ہوگئی۔ لیکن بندر کو قبل از وقت ہی چڑھاوے کی چیزوں کی فکر ہوئی۔ اس نے رسّی کی حد تک بڑھ کر ہاتھ بڑھایا تھالی گو دُور تھی۔ شیلاؔ نے انچ بھر اور دور کھسکالی۔ بندر نے کھونٹی کے مرکز پر دو نصف دائروں میں چکّر کی چہل قدمیاں کیں اور تیسری ٹہل میں جھٹ کھونٹی کی طرف سرکر، دھڑ بڑھا۔ پچھلا پیر لمبا کر تھالی پیر سے پکڑلی لیکن فوراً ہی ادھر شیلاؔ نے اپنی تھالی پکڑلی۔ زور ہونے لگے۔ شیلاؔ کے بھولے چہرے پر حیرت، غصّہ اور پریشانی کے آثار آ گئے۔ گالوں پر سرخی، منہ پر گھبراہٹ ساڑی سینے سے ہٹ گئی۔ "اچھا... لے۔" کہہ کر تھالی بندر کی طرف ڈھکیل سیدھی کھڑی ہوگئی۔ غصّہ بھری نگاہوں سے بندر کو جو کہ ناریل، سیندور اور پھولوں میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر گھورتی رہی۔ اور پھر ناگن کی طرح بل کھاتی، بجلی سی کوندتی، تیزی سے کمرے پار کر کے اپنے پُر تکلف آراستہ کمرے میں پہنچ کر اس کے دروازے بند کر کے ایک کونے میں لٹکے ہوئے لنکا کے جزیرے کو ہتھیلی پر اڑاتے ہوئے ہنومان کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ اور آنکھیں بند کر کے بصد عجز و انکسار اپنے ملنے والے پتی پروفیسر دیا شنکر دوبے (جن کے ساتھ پھیرے بچپن ہی میں پھر چکے تھے، لیکن اُن سے وہ ابھی تک نہیں ملی تھی) کے حق میں دعائیں مانگنے لگی۔

چونکہ طرح طرح کے لوگ امیدوں میں پھنسے، منصوبے گانٹھے طرح طرح سے دنیا کے بکھیڑوں میں اُلجھے اصل خدا اور اصل خدا کے اٹل منصوبوں سے

بے خبر طرح طرح کے خداؤں کی پوجا میں مصروف رہتے ہیں، اس لئے فردوس کاٹیج کے باشندے بھی پرستش میں مصروف تھے۔ اور یہ اتفاق تھا کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ شیلا ہنومان جی کے گیان بیں تھی۔ یہ لوگ بھی ٹھیک اسی وقت فردوس کاٹج سے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ نیچے بیر بھٹی کی آبادی میں عجب شاہ کے مزار پر سرِ عقیدت خم کئے مرادیں مانگنے اور منتیں ماننے میں مصروف تھے۔ قریشی صاحب مزار کی چھوٹی سی چار دیواری کے باہر اپنی موٹر کی پچھلی سیٹ پر سگار منہ میں دبائے آدھے لیٹے، اور آدھے بیٹھے، تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھولے، ہلکے ہلکے سگار کا دھواں اُڑانے میں مشغول تھے۔ لیکن ان کی چہیتی پر جمال بیوی، جگر پارے، دل کے ٹکڑے کمزور لڑکے کی تندرستی اور صحت کی دُعا، ہاتھ اٹھا، آنسو ڈبڈبائے، دوزانو قبر کے پائنتیانے بیٹھی مانگ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف مٹھائی سے بھری دو سینیاں ریشمی رومال سے ڈھکی، مٹی کی رکابی میں سُلگتے ہوئے لوبان سے روحانیت حاصل کر رہی تھیں۔ اُن کے دوسری طرف قبر کے برابر زمین پر پڑا بچہ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ان سے پیچھے بچے کی طرف احمد بیٹھے بیکار چٹکیاں بجا رہے تھے اور لوبان کی طرف فردوس بانو کی ماں بیٹھی لوبان کا متبرک دھواں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ کر منہ پر ملنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھیں۔ قبر کے سرہانے کی طرف جہاں چھوٹے سے محراب دار دھوئیں سے کالے طاق میں مٹی کا دیا شام کے انتظار میں منہ فق بیٹھا تھا۔ بی اماں کا ڈھیر ہاتھ اٹھائے، آنکھیں مچکائے من ہی من میں کہہ رہا تھا "شاہ صاحب لڑکے کے دل سے اس جورو کی محبت کم کیجئے اور میری محبت اور عزت اُس کے دل میں بڑھائیے۔"

دروازے کے برابر لیکن چار دیواری کے اندر نند کھڑی تھیں اور اُن کی گود میں بھاوج کا 'فر' کا کوٹ، بچے کی رضائی، اماں کا دوشالا تھا۔ یہ انہیں کو کلیجے سے چمٹائے، آنکھیں بند کئے کھڑی تھیں گویا برسوں کے بعد یہ پیارے ملے ہیں سینے سے چمٹائے محبت کی سینک لے رہی ہیں۔ مگر نہیں صاحب یہ بھی دل میں کہہ رہی ہیں "شاہ صاحب بھابی کے دل میں کچھ ایسا ڈالئے کہ میرا مہینہ کر دیں۔

اور میں سب بکھیڑوں سے الگ اپنے ہی گھر میں بدایوں میں رہوں۔"

دروازے کے برابر لیکن چار دیواری سے باہر مدراسی آیا، کافر سیاہ، جس کو اندر آنا منع تھا کھڑی ہوئی ہر ایک کو باری باری سیاہ چہرے میں سفید دانت دکھا رہی تھی۔ اور چونکہ ہر ایک اپنی طرف مصروف تھا۔ لہٰذا موقع کے منتظر متولی مجاور یا سجادہ نشین جو بھی سمجھو۔ ولی کامل شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجرے کے دروازے کے باہر دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تسبیح میں مصروف تھے۔ آپ کا نورانی گندمی چہرہ تیل میں چمکتا اوپر کی طرف گنبد نما جالدار ٹوپی، نیچے کی طرف سیاہ چوکھنٹی ڈاڑھی سے اور دائیں بائیں دونوں طرف بل پر بل کھاتے گیسوؤں، ٹھکینوں میں وابستہ روحانیت کے تمام مدارج طے کر کے حضور خداوندی میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جیسے ہی فردوس بانو نے دعا ختم کر کے آزو بازو دیکھا آپ ہوشیار ہو گئے فوراً تسبیح ہاتھ میں لپیٹتے ہوئے اٹھے۔ کونے میں رکھے ہوئے کائی زدہ گھڑے میں زنجیر سے بندھا ٹین کا تاملوٹ ڈال کر پانی نکالا۔ جلدی سے تین کلیاں کر مٹھائی کی سینیوں کے پاس دوزانو آبیٹھے۔ مزید لوبان سے مزید دھواں اُڑایا گیا۔ چراغی کے پانچ آنے اور لوبان کے پانچ آنے، نذرانے کا سوا روپیہ لے کر نذرانہ، فاتحہ ہوا۔ چادر چڑھائی گئی۔ منت کا ناڑا باندھا گیا۔ اور چلتے چلاتے پھر ایک مرتبہ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھ گئے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے کنپٹی پر سے رخسارِ مبارک پر آکر ٹہلنے والی گستاخ جوں کو چٹکی سے مسل کر حجرے کی طرف پھر رُخ کیا۔ وہاں سے قلم دلوات اور کاغذ لا کر پھر بیٹھ گئے۔ کاغذ گھٹنے پر رکھ دعاؤں پڑھ دعائیں پڑھتے ہوئے تعویز لکھنا شروع کر دیا۔ کئی روز سے مینہ برابر پڑ رہا تھا۔ دوپہر سے رُکا تھا لیکن اب بوندیں پھر پڑنا شروع ہو گئیں۔ باہر کھڑی مدراسن نے شور مچایا۔ "آئی، آئی، میم شاب پانی گرتی" جلدی جلدی سب لوگ موٹروں میں سوار ہوئے۔ شاہ صاحب نے آخری مرتبہ دعا پڑھ کر موٹر میں جھک کر لڑکے پر پھونک ڈالی۔ قریشی صاحب نے اپنا موٹر بڑھایا۔ پھر احمد نے۔ بیرجی

کے چھوٹے سے بازار میں سے جب موٹر نکل رہے تھے تو ایک بیل گاڑی کے ستدِ راہ ہو جانے سے دونوں موٹر کچھ دیر رُکے۔ وہاں کے ایک مکان کے اوپر سب نے پروفیسر دیا شنکر کو کرسی سے بندھے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے NOW THEN MY LORD "تو یہی وجہ ہے کہ آپ دیش کے انشکاروں، منشی شنتوں کے اونچے وکاش کے جیو سنسار ہوتے ہیں۔ اور ہم چنتا شیتا نئی تکنتا کلاودیا آدمی کے پاپوں سے سمالوچک ہو کر شدھ سوبھاش ہوتے ہیں۔ آج بھارت کے وہی ادھ سمالوچک کے گُن گانے کو مان سیک دشون میں پرکٹ کرنے کو موٹر جا رہے ہیں، اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب نے جھک کر موٹروں کو غور سے دیکھا اور پھر NOW THEN MY LORD کہہ کر کچھ اور کہنے لگے۔ لیکن بیل گاڑی ہٹا جانے سے گاڑی پھر چل دی۔ ان لوگوں کو اُس پاگل کی باتوں پر سخت حیرت تھی۔ لیکن ان لوگوں کو کیا معلوم کہ اُن کی غیر موجودگی میں فردوس کاٹیج میں ایک اور پاگل اس سے کہیں زیادہ پاگل پنے کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ نوجوان قریشی صاحب کا حقیقی بھتیجا عبدالحکیم تھا۔ جو کہ احمد کی کوٹھری میں اپنا پھیلا ہوا شیو کا سامان، مسکی ہوئی ٹائیاں، ملگجے سوٹ، گھسے ہوئے موزے وغیرہ سمیٹ کر سامان باندھنے میں مشغول یہ شعر بھی پڑھتا جاتا تھا اور مقدر کو سنے اور قادرِ مطلق کو گالیاں بھی دیتا جاتا تھا ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

ارے واہ چچا غالب خوب کہا ہے۔ مگر یار مقدر کی جوتے کاری تمہاری کھوپڑی پر بھی پوری طرح ہوئی ہے۔ ورنہ ہرگز یہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے کیا کہا ہے ؎

متاع بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

بھئی واہ کیا کہا ہے۔ بڑھؤ کو رہزن بنا دیا۔ ارے رہزن نہ سہی تو نہ سہی لیکن یار... ایسے قسّامِ ازل کو الرحمٰن الرحیم کا لقب اختیار کرنا کہاں تک صحیح ہے۔ ارے بھئی قسّامِ ازل آنکھیں بند کر کے جس کو چاہا جتنا دے دیا۔ سب تمہارے آگے بے بس ہیں۔ مگر بڑے میاں الرحمٰن الرحیم بنتے تو تم کو شرم آنا چاہیئے۔ کیا اسی کا نام رحم

اور انصاف ہے۔ آج میں اس کوٹھی میں راج کرتا ہوتا۔ یہ کوٹھی میری ہونی چاہیئے تھی۔ بریلی اور بدایوں کے گاؤں بمبئی کی بلڈنگیں، بینکوں میں کا روپیہ سب میرا ہونا چاہیئے تھا۔ بڑے بیٹے کا لڑکا میں ہوں مگر واہ آج پچھتر روپے چھ آنہ کی ملازمت پر ہوں، اور اس سسری نوکری کے بھی لالے پڑے ہوتے ہیں۔ کیا ہرج تھا اگر والد صاحب کچھ دن اور زندہ رہ جاتے۔ کچھ ہی دن اور صرف ڈیڑھ برس اور زندہ رہ جاتے۔ اچھا اللہ میاں اگر آپ کو ان کے بلا لینے کی اتنی ہی سخت ضرورت تھی تو بڈھے دادا کو ہی پہلے بلالیا ہوتا۔ ارے زیادہ نہیں دس پانچ دن پہلے ہی دادا صاحب لڑھک گئے ہوتے۔ تو میں مجوب نہ ہوتا۔ کیا بے انصافی ہے۔ کیا بے انصافی کے قانون ہیں۔ آج میں مجبور ہوکر چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔ اور چچا صاحب نواب بنے مزے اڑاتے ہیں ذراسی سفارش کے لئے آٹھ دن سے شاگرد پیشہ میں پڑا ہوں۔ جس دن یہاں آیا تھا تو خیر واقعی برنج کے کھلاڑی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ چلو احمد ہی کی کوٹھری میں ٹھہر گیا۔ لو وہ بھی چلے گئے اور کسی کے منہ سے یہ نہ پھوٹا کہ اب کوٹھی کے کمروں میں سے کسی میں آجاؤ۔ ذرا سی سفارش کو کہا تو ڈرتے ہیں کہ میری بات جائے گی۔ ہاں بھئی تمہاری بات نہ جائے۔ چاہے میں فاقہ کروں۔ لعنت ہے ایسے چچا پر اور لعنت ہے مجھ پر بھی جو میں ان کے پاس آیا۔ لو دیکھو آج کا وعدہ تھا کہ کرافورڈ صاحب سے میرے لئے ملیں گے۔ تو چل دیئے۔ کہاں ؟۔ مزار کی پوجا کرنے۔ ارے جب ان بڑھو کی ہی پوجا کرنے سے کچھ نہیں ہوتا مٹی کے ڈھیروں کی پوجا سے کیا ہوگا۔"

اسی طرح بکتے ہوئے سامان باندھ، مالی کے کندھے پر رکھ، سڑک پر جا، تیز بارش میں بھیگتے ہوئے نیچے جاتی ایک لاری میں بیٹھ حکیم روانہ ہوگیا۔ راستہ میں یہ شعر بھی وردِ زبان تھا ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاعِ بردہ کو سمجھے ہیں گویا قرض رہزن پر

چوتھا باب

انشاء اللہ خاں انشا تو محو لئے تھے۔ اُن کا کہنا ؎

ناچے ہے پڑی عالمِ لاہوت میں انگلی

محض بیہودہ گوئی خالص ہزل ہے۔ لیکن دراصل عالمِ لاہوت کا نقشہ یہ ہے، ستر ہزار برس پورب، ستر ہزار برس پچھم، ستر ہزار برس اُتر اور ستر ہزار برس دکھن، ستر ہزار برس اُوپر اور ستر ہزار برس نیچے اگر خیال دوڑے تو اس عالم میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خلاء ہی خلاء ہے کہیں کچھ نہیں ہے اور اس انتہائی تنہائی اور نابودیت کے وسط میں اگر ہے تو صرف ایک چھوٹی سی ٹائم پیس ہے جو عالمِ لاہوت میں ٹک ٹک کر رہی ہے۔

صدیاں اور قرنیں گزر گئی ہیں۔ عالمِ لاہوت کی گھڑی ٹِک ٹِک، ٹک، کر رہی ہے۔ صدیاں اور قرنیں گزر جائیں گی اور عالمِ لاہوت کی گھڑی ٹِک، ٹِک کرتی رہے گی۔

جب سیارے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں، جب دنیائیں پاش پاش ہو جاتی ہیں تو عالمِ لاہوت کی گھڑی تنہا اس وقت بھی ٹک، ٹک، ٹک، کرتی ہوتی ہے۔

جب چڑیا کا انڈا گھونسلے میں سے گر کر بچے سے ہو جاتا ہے اور چڑیا چیں چیں، چیں چیں کرتی پھرتی ہے تو عالمِ لاہوت کی ذاتِ واحد گھڑی اس وقت بھی ٹک، ٹک، ٹک کرتی ہوتی ہے۔

مست شرابی کی بے سُری تانوں سے بھوکے یتیم کی ٹھنڈی سانسوں سے بیوہ کی سسکیوں سے، حسن پرست نوجوانوں کے قہقہوں سے بے خبر عالمِ لاہوت میں گھڑی ٹِک ٹِک، ٹک کرتی ہے۔

ذاتِ باری کے مذاق اڑائے جاتے ہیں۔ اس پر گالیاں پڑتی ہیں حتیٰ کہ جانوروں پتھروں، مٹی کے ڈھیروں میں خدائی اوصاف لگا کر ذاتِ مطلق کو چڑایا جاتا ہے عالمِ لاہوت کی گھڑی پھر بھی ٹک، ٹک، ٹک ہی کرتی رہتی ہے۔

کیا شانِ بے نیازی ہے ٹک، ٹک، ٹک۔

شیلا سن، فردوس بانو سن، سن اے عبد الحکیم سن :-

ٹک، ٹک، ٹک۔

پہاڑوں پر کی بارش میں، بلا کی ٹھنڈی تیز ہواؤں میں، بھیگی ہوئی بندریا اندھیری رات میں، اندھیرے جنگل کے ایک بھیگے ہوئے ٹپکتے درخت پر بیٹھی ہے۔ برساتی پہاڑی نالہ کہیں پاس ہی اندھیرے میں گڑگڑاتا، دھڑدھڑاتا جھرجھراتا بہہ رہا ہے۔ آزو بازو پہاڑ کی سیاہ ڈھالیں اس کی آواز سے گونج رہی ہیں اور نالہ کی ان پیہم آوازوں میں سے بچ کر نکلتی ہوئی کبھی کبھی بندریا کی دبی ہوئی لمبی آواز سنائی دیتی ہے۔ اندھیرا ہے، بارش ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں۔ نالہ دھڑدھڑا رہا ہے، نالیاں جھرجھرا رہی ہیں اس میں بے کسی کی اُو۔ اُو ہے اور پھر اُو۔ اُو ہے۔ لیکن اب کی لمبی درد آمیز اُو۔ اُو کے بعد خی خی خی۔ یہ کیسی؟ کیا کوئی اسے چھیڑ رہا ہے۔ کیا کوئی اندھیرے میں اس کے برچھیاں چبھو رہا ہے۔ "اُو۔ اُو۔ خی خی خی خی" کیا بات ہے؟ ضرور کسی تکلیف میں ہے۔ رہ رہ کر اس کے درد سا ہوتا ہے۔ یا کوئی سخت بے چینی ہوتی ہے۔

کچھ جانور اس اندھیرے میں حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ دو چار گلہریاں درختوں سے اُتر کر گھانسوں اور پودوں میں کھسکھساتی مغربی چڑھائی کی طرف جا رہی ہیں۔ اس طرف چند سیتیاں اور خرگوش بھی جا رہے ہیں۔ بسیرا چھوڑ چھوڑ کر چند پرندے بھی گرتے پڑتے پھڑپھڑاتے ادھر ہی کو اُڑ رہے ہیں۔ بندریا-

ابھی تک وہیں بیٹھی درد آمیز اُو، اُو، اُو اور پھر گھبرائی ہوئی خی خی خی کر رہی تھی۔ لیکن اب وہ بھی ڈالی ڈالی کر کے درخت سے نیچے آگئی۔ مگر یہ بالکل دوسری طرف اسی طرح آوازیں نکالتی چلدی۔ کدھر جارہی ہے؟ فردوس کاٹج؟ ہاں ہاں وہیں۔ اندھیرے میں چھپچھپاتی برابر اسی طرف چلتی رہی۔ ایک جنگلی بلی بھی اس کو سامنے سے آتی اور دوسری طرف جاتی نظر آئی۔ مگر یہ نہ رُکی اور آخر سوتے ہوئے فردوس کاٹیج کے پاس پہنچ گئی وہاں بالکل سناٹا تھا۔ لیمپ بھی قریب قریب سب گُل کر دیئے گئے تھے۔ کمروں کے اندر دو تین مدھم روشنیاں معلوم ہوتی تھیں۔ بندریا نے اسی برآمدے میں آکر اُو۔ اُو کرنی شروع کر دی۔ مگر جب جواب نہ ملا تو خی خی خی کر کے اِدھر اُدھر دوڑی۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے پاس اُو۔ اُو کی۔ بند دروازوں کے پاس اُو اُو کی۔ مگر کہیں جواب نہ ملا۔ آہ بچہ کہاں ہے؟ جلدی اور گھبراہٹ میں خی خی خی کرتی دوڑی پھری چھت پر چڑھی، نیچے کودی، کوٹھی کے دوسری طرف بھاگ کے گئی۔ ادھر اُو، اُو۔ اُدھر اُو۔ اُو کی اور جب کمروں میں جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر کوٹھی کا چکر لگایا۔ گھبرائی پریشان بندریا اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر دوڑی پھر رہی تھی کہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی نظر آگئی۔ کُود اس میں، وہاں سے کمرے میں کرسی پر کودی، میز پر چھلانگی۔ آتشدان پر اچھلی۔ گلدان گرا دھڑ سے۔ اُو۔ اُو کرتی بندریا نے ایک دروازہ اور دیکھا۔ یہ اس میں سے ہوکر دوسرے کمرے میں دوڑی وہاں بھی گھبرائی بوکھلائی پھری۔ اور اس میں سے تیسرے کمرے میں ٹھیک اس وقت پہنچی جب کہ گھر کے اندر فردوس بانو کی گھگی کی آواز بھی گھر کے باہر کے تمام پہاڑوں پر پھیلی ہوئی بھاری مدھم خوفناک گڑگڑاہٹ میں مخلوط ہونے لگی تھی۔

یہ خوفناک آواز ہزاروں فٹ نیچے سے پیدا ہوکر بتدریج بڑھتی اور میلوں میں پھیلتی جارہی تھی۔ اب کمرے اس آواز سے گونج رہے تھے، دیواریں

تھرا رہی تھیں۔ بندریا کی آواز سے جاگی ہوئی فردوس بانو اور فردوس بانو کی آواز سے جاگے ہوئے اور لوگ، سب اس آواز سے خوفزدہ اوسان خطا اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ محبت اور خالص محبت کی ماری بندریا بچے کی تلاش میں سرگرداں پہنچی، اور قریشی صاحب کے اکلوتے لڑکے کی مسہری پر پہنچی، محبت، محبت اور خالص محبت! جس میں انتقام، حسد، رشک اور نفرت، کبھی شامل نہ ہو سکتے تھے۔ دل کے لئے پھائے کی طالب تھی۔ سینے سے چمٹانے کے لئے بچے کی ضرورت تھی۔ بچہ مل گیا۔ کیسا؟ اور کون اور کس کا۔ اس سے کیا مطلب کپڑوں کو نوچا۔ رضائی کو کھینچا اور جلدی سے آدم کے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ مدراسن بری طرح چلائی۔ بندریا نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور وہیں سے جست کی۔ اِدھر دوڑی اُدھر اُچکی۔ کچھ لوگ اٹھ بیٹھے تھے، کچھ چلا رہے تھے، کچھ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کچھ دروازے اور بھی کھل گئے تھے۔ ہڑاہڑ، ہڑاہڑ۔ ہاؤں ہاؤں سے دل کانپ رہے تھے۔ دیواریں کانپ رہی تھیں۔ مکان اور درخت ہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی کانپ رہے تھے۔

اُس وقت بندریا گھر سے باہر بچے کو لئے ہوئے نکلی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ پہاڑ گر رہا تھا۔ لینڈ سلپ ہو رہی تھی۔ پوری زمین، مکان، باغ، درخت اوپر نیچے کے جنگلوں سمیت تیزی سے پھسل رہی تھی۔ سکنڈوں نہیں بلکہ پلکوں حالت بدل رہی تھی۔ زمین جگہ جگہ پھٹی۔ سیدھے درخت اپنی جگہ ٹیڑھے بکڑے ہو رہے تھے۔ قریشی صاحب کی کوٹھی کانپی، لرزی، پھوٹ پھوٹ ہو کر بزدل کی طرح اڑ اڑا کر بیٹھ گئی۔ دھڑ دھڑ۔ ہاؤں ہاؤں کی بڑھتی ہوئی تا بفلک آوازوں میں گری ہوئی کوٹھی کا ملبہ نیچے دوڑا۔ پیچھے سے گرتے پڑتے سرنگوں درخت دوڑے، ہزاروں من کے پتھر، لاکھوں من کی سلیں دوڑیں۔ یہ سب آپس میں مخلوط ہوئے اور نیچے کو دوڑے۔ ہزاروں قدآور درخت، کروڑوں من ملبہ لاکھوں من پتھر ایک دوسرے پر گرتے۔ پلٹے کھاتے، ٹوٹتے، توڑتے مسمار ہوتے،

خود تباہ ہوتے اور سامنے کی ہر چیز کو تباہ کرتے گر رہے ہیں اور گرتے چلے جا رہے ہیں اور ان ہی میں، ان آوازوں میں، اس اندھیرے میں لاکھوں لڑھکتے ہوئے پتھروں میں، تیز پھسلتی ہوئی سلوں میں، مشتِ خاک تین ٹانگ کی بندریا ہے۔ (کیونکہ ایک ہاتھ سے بندریا بچے کو تھامے ہے) چھوٹے پتھروں سے کتراتی ہے۔ بڑے پتھروں سے کتراتی ہے۔ بڑے پتھروں پر چڑھ جاتی ہے۔ سلیں اور چٹانیں اس کو پیس دینے کے لئے پھسلتی ہوئی لپکتی ہیں۔ یہ کود کر ان ہی پر سوار ہو جاتی ہے دیوہیکل درخت سینکڑوں ہاتھ پھیلائے اس پر لڑھکتا ہے۔ جھاڑو سا دیتا سامنے کی ہر چیز سمیٹتا آتا ہے۔ بندریا اس کی ڈالی ڈالی اچکتی ہے۔ لاکھوں، کروڑوں من سلیں، پتھر، درخت، مٹی برابر اوپر سے گر رہے ہیں۔ پہاڑ کا اس طرف کا پورا ڈھال چوٹی سے لے کر نیچے بیر بھٹی تک پھسل پڑا ہے۔ بیر بھٹی کی آبادی کئی سو فٹ ملبہ کے نیچے دفن ہو گئی ہے۔ کیا جھونپڑا کیا مکان، کیا امیر، کیا غریب، کیا پیر، کیا فقیر، سب دفن ہو چکے ہیں۔ فردوس کاٹج کے منتشر ٹکڑوں پر گزوں بلکہ بلیوں ملبہ گر چکا ہے۔ اور گر رہا ہے اور اب بھی اس شور قیامت میں، اس اندھیرے میں بندریا پتھر سے چٹان پر اور چٹان سے درخت پر درخت سے بگل جانے والے ملبہ پر اُچکتی ہے۔ تین ہی ہاتھ پیر ہیں اور ایک ہاتھ سے بچہ سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ بندریا ہر وقت اچھل رہی ہے۔ ہر کچل کر پیس لے جانے والی چیز پر اُچک کر سوار ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب اُس چیز کے خود دفن ہونے کی نوبت آتی ہے تو اس سے اوپر آنے والی چیز پر اُچک کر سوار ہو جاتی ہے اندھیرے میں گرد اس قدر ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ آوازیں ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ قیامت برپا ہے.....

رات کی تباہ کاریوں کے بعد فلکِ پیر انتہائی معصومیت سے مسکرایا۔ خاموش پہاڑوں میں صبح ہوئی۔ بادل بھی پھٹ چکے ہیں۔ کہرا بھی نہیں ہے۔ ہوا بھی بند ہے۔ دو چار چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ بیر بھٹی کی آبادی تین سو فٹ ملبہ اوڑھے

ٹھنڈی پڑی سو رہی ہے۔ سامنے مخمور کالا پہاڑ ڈیڑھ میل چوڑا، دو ہزار فٹ لمبا کتھئی بھورا دہانہ پھاڑے جمائی سی لے رہا ہے۔ لمبی چوڑی جمائی ہے کچھ عرصہ لگے گا۔ پانچ چھ سو برس میں پھر اس دہانے کو گھنے جنگل اُگ کر ڈھانک لیں گے۔ ابھی تو یہی خالی جگہ ہے جہاں زمین اوڑھے بیر بھٹی دبی پڑی ہے اور یہ بے ترتیب ڈھیر بھی یا تو جب تک بہہ کر خلیج بنگال کی تلی میں ہوگا یا اس پر بھی گھنے جنگل اُگ کر اُسے سرسبز سیر گاہ بنا دیں گے۔ لوگ جنہوں نے بیر بھٹی کا نام بھی نہ سُنا ہوگا، یہاں آئیں گے، چلیں گے، پھریں گے۔ قہقہے لگائیں گے۔ لیکن فی الحال یہ مٹی پتھر اور چٹانوں کا ڈھیر ہے۔ جس میں بڑے بڑے درختوں کی ٹوٹی ڈالیاں اور پتوں دار شاخیں آدھی دبی اور آدھی نکلی جا بجا نظر آتی ہیں اور خال خال انسانی ہاتھوں کی بھی کارگزاریوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ اوپر کی سڑک کا ایک فرلانگ کا پتھر پڑا ہوا سات کا منحوس نمبر آسمان کو دکھا رہا ہے۔ ایک اور جگہ ایک نالی دار ٹین کی چادر کا ایک سِرا زمین میں سے خوفزدہ جھانک رہا ہے۔ ملبہ کے بیچوں بیچ نہ معلوم کس طرح اور کیوں کر کسی مکان برآمدے کا ایک لکڑی کا کھمبہ زمین میں آدھا دبا آدھا باہر نکلا ہوا کھڑا ہے اس کے اوپر نُچی کھچی کپڑے کی ایک دھجی چمٹی ہوئی چھوٹی سی جھنڈی کی طرح لہرا رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لینڈ سلپ نے مہم سر کرنے کے بعد اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ اس جھنڈے سے کافی فاصلہ پر سسکتے ہوئے انسان کے بچے کو اب بھی سینے سے چمٹائے، زخموں سے چوُر بندریا تشنج کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ صبح کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔

دُور سے آواز آتی ہے NOW THEN MY LORD پھر بڑ بُڑاتی ہوئی آواز بڑھتی ہوئی قریب آتی ہے۔ پروفیسر دیا شنکر دو بے صرف کوٹ اور قمیص پہن کر لکچر دیتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ آتے آتے اس کھمبے اور جھنڈی

کے قریب آتے ہیں۔ رکتے ہیں۔ اُسے غور سے دیکھ کر یوں خطاب کرتے ھیں۔
NOW THEN MY LORD مجھے آج آپ سے تعارف حاصل کر کے جو شرف حاصل سے ارطباع ہوا ہے وہ نشاط کامل الہام غیبی میں بھی میسّر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آج میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ نطق اور خیال کے باہم تصادم کو معدوم البقا ٹھہرا دینا غلطی اور سخت غلطی ہے۔ اس لئے اس خاکسار کی عرض ہے کہ آپ یہیں ٹھہریں اور بندہ آگے جاتا ہے۔

اس عالمانہ مزاج پُرسی کے بعد پروفیسر صاحب جنڈرے کو چھوڑ آگے بڑھ گئے۔ اور جیسے ہی وہ دُور چلے گئے ایک ڈھیٹال نکلی ہوئی چٹان کی آڑ میں سے جہاں وہ دیر سے چھپا بندریا اور بچے کو دیکھ رہا تھا نکلا۔ مردہ بندریا کی گود سے بچے کو اپنی گود میں لے دوسری طرف روانہ ہوگیا۔ اب پھر خاموشی اور تنہائی ہوگئی۔ بندریا کی لاش پڑی ہے۔ جانور کی لاش پر کوئی نہیں روتا۔ آہ! قریشی کے اکلوتے لڑکے! لاکھوں کی جائداد کے وارث، تیری لاش پر میں روؤں بے شک تو مر گیا۔ مکانوں، زمینوں، گاؤں کا مالک قریشی کا لڑکا تو مر گیا۔ بندریا نے اپنی جان دے کر جسے بچا لیا ہے وہ اب ایک جانور کا بچہ ہے۔ کیونکہ ڈھیٹال اُسے پالے گا۔ وہ جئے گا۔ جوان ہوگا۔ مگر ایک دوسرے جنم میں جہاں طرزِ خیال اور ہوگا، جہاں طرزِ تکلم اور ہوگا۔ طرزِ زندگی اور ہوگا۔ طرزِ معاشرت اور ہوگا تو اپنی جاگیروں سے بے خبر، اپنے مذہب سے ناآشنا، اپنے تمدن سے ناواقف ڈھیٹال بنا اپنے طبقے کو خوفزدہ دُور سے دیکھا کرے گا اور تیرے اصلی ساتھی تجھ سے اس طرح بچ کر چلا کریں گے گویا تُو انسان نہیں ہے۔ بے شک تو نیم وحشی ڈھیٹال ہے اور وہ روشن خیال اور روشن دماغ انسان ہیں۔

انسان کو حیوانیت کے درجے سے نکال کر خدا کی نابئیت کا تاج پہنانے والا، اگر انسان کا عقل سے پُر دماغ ہی ہے تو تعجب ہے۔

کیا دراصل انسان صحیح الدماغ ہے؟

ہندو بن کر نہیں، مسلمان بن کر نہیں، قریشی یا ڈھیال بن کر نہیں۔ انسان اور صرف انسان بن کر اے انسان اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ۔ تو آئینۂ حیرت ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!
ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔

ہر فرعونے را موسیٰ

دن ڈھلتے ہی جنگل کے جانور بیدار ہو کر اپنی اپنی پوشیدہ نشست گاہوں سے نکلنے لگے اور مالا کا وہ جنگل جو دن بھر چوپایوں سے خالی نظر آتا تھا آباد ہو گیا گو چڑیوں کے بسیرا لینے سے خاموشی ضرور چھا گئی۔ لیکن سنسان سال بنی میں اب جا بجا حرکت کرتے ہوئے چوپائے نظر آنے لگے۔ چونکہ دن کی ہلکی ہلکی روشنی اب بھی موجود تھی اور جنگل کے واسطے ابھی بہت سویرا ہی تھا۔ اس لئے سوُر، چیتل اور نیل گائے ایسے ہی بیچ ذات جانوروں کی صورتیں فی الحال نظر آ رہی تھیں جو کہ پوری طرح رات نہ ہونے کی وجہ سے قدرے بے خوف اِدھر اُدھر خوراک کی جستجو میں جا رہے تھے۔ اس امن اور خاموشی کے عالم میں ایک بھاری مست اکڑ سوُر کبھی کبھی اپنی بدطینتی کی وجہ سے تھُو تھُو، خوک خوک کر کسی پاس آنے والے جانور پر دوڑ پڑتا تھا اور اس کا دوُر تک پیچھا کرنے کے بعد پھر واپس آکر بھاری تھُوتھنی سے موُسل کی جڑیں کھودنے میں لگ جاتا تھا۔ سال بنی کے مشرق کی طرف گھنے سال اور نیچے گھنی جھاڑیوں نے بالکل ہی اندھیرا کر رکھا تھا۔ مغرب کی طرف ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی اس لئے اب بھی موجود تھی کہ اُدھر ہی پاس لگا ہوا سال بنی کا کنارہ تھا۔ جس کے اختتام پر بیلوں کے جالوں سے ملے ہوئے کٹھ روکھ کے اونچے اور کانٹے دار جھاڑیوں کے نیچے درختوں کی تھوڑی سی چوڑائی کے بعد مالا ندی کا چوڑا پاٹ اپنی کیچڑ، دلدل اور چھچلے پانی کو ہاتھی

چُھپواں گھانس میں چھپائے ہوئے ساکت اور بھورا پھیلا ہوا تھا۔ ندی کے اس پاٹ میں بلکہ اس اونچی گھاس کے سمندر میں جا بجا انتہائی گھنے چھوٹے چھوٹے جنگل کے ٹاپو بھوری گھانس میں سے نکلے ہوئے دھندلے پڑ رہے تھے۔

بنڈ ہیلے کو مالا کی گھاس کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ زمین میں گھسی ہوئی بھاری تھوتنی وہیں مٹی میں دھنسی کی دھنسی رہ گئی۔ کانوں نے آہستہ آہستہ جنبش جاری رکھی۔ آواز پھر بند ہوگئی تھی۔ کچھ دیر اسی حالت میں انتظار کرنے کے بعد ناک کو دوبارہ مٹّی میں جھٹکے سے دھنسایا ہی تھا کہ کُھس کُھس۔ کھساک' آواز آئی۔ بنڈ یلا جڑ کھودتے میں رُکا۔ اور پھر بغیر سر گھمائے، بدن کے ایک ہی جھٹکے میں پوری جان سے گھوم۔ مالا کی طرف رُخ کر، پتلی دُم کی جلیبی بنا، ساکت کھڑا ہو گیا۔ چند جانوروں کی اونچی اور سوکھی گھاس میں سے نکلنے کی آواز برابر آرہی تھی۔ نگاہ کے کمزور سُور نے سرسراہٹ کی آواز سے ہی آنے والے جانوروں کو تھوڑی سی غلطی کے ساتھ پہچان لیا۔ وہ سمجھا کہ پھر کوئی بدتمیز نیلا مع اپنی گایوں کے واپس آرہا ہے۔ اس روز کئی نیل گائے اُسے ستا چکے تھے۔ دو دو قدم اور دو دو قدم رُکتا ہوا۔ چمکتی ہوئی سفید بل کھائی ہوئی کھاپوں سے مرصّع تھوتھنی کو جھٹکے دیتا ہوا چلا۔ سامنے بل پر بل کھائے ہوئے جنگلی بیلوں کے موٹے ننگے تنے رسّوں کی طرح جھولوں کی صورت سے لٹکے ہوئے، اونچے درختوں سے جھاڑیوں پر اور جھاڑیوں سے درختوں پر پھیلے ہوئے جال سا بنائے ہوئے تھے۔ اور وہیں ایک جھاڑی کے برابر لٹکی ہوئی بیل کے نیچے مالا کی ترائیوں دلدلوں اور مالا کی ہاتھی چھپواں گھانسوں کا اصلی باشندہ! زبردست گوندھ موٹے شاخدار سینگوں کی پرچھائیاں بلند کئے، پیچھے رُکتی، ٹھٹکتی آنے والی مادینوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

کم عمر نر، پٹھے اور مادینیں ایک ایک کر کے اونچی گھانس میں بنی ہوئی پتلی پگڈنڈی میں سے نکل کر، چوکنّی چاروں طرف دیکھتی، رُکتی، اپنے بچوں کو ساتھ لیتی

بڑھ رہی تھیں۔ اور ایک ایک دو دو کر کے نر کے پیچھے جمع ہو رہی تھیں۔ نر گوند جنگل کا سب سے بڑا چوپایہ۔ اپنے جُثّے اور اپنی طاقت پر مغرور گوند، نتھنے پھلائے، کانوں کی کٹوریاں آگے گھمائے، دُم کی پھاپی تیزی سے ہلاتا۔ جھنجھلایا ہوا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون گستاخ اور بدتمیز راستہ میں ہے۔ سامنے سال بنی میں نیچے نیچے پودے اور جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ لیکن کوتاہ قد سُور ان میں پنہاں نہ تو خود نظر آتا تھا اور نہ اپنی کمزور بینائی کی وجہ سے خود ہی گوند کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی نیل گائے سمجھے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور مادینوں کی چاپ کے جب قریب آگیا تو " تھو تھو خوک، تھو تھو خوک " جھڑکیاں آمیز آواز نکالتا ہوا لپکا۔ چھوٹی جھاڑیاں اور گھانسوں کو سڑ سڑاتا پھڑ پھڑاتا نکلا۔ گوند سے بندرہ گز کے فاصلہ پر ہوگا کہ دفعتہً اس نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔ سامنے زبردست گوند سینگوں کی چمکتی ہوئی سفید نوکیں برچھیوں کی طرح تانے بے خوف کھڑا اُسے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ نیلے اور جھانک ڈرا دھمکا کر بھگائے جا سکتے تھے۔ لیکن گوند؟ گوند؟ توبہ۔ توبہ! بڑھتا ہوا سُور کھٹ سے رُکا! سٹ سے پورا جسم گھما اور نوک دُم تھو تھو۔ تھو تھو کرتا ہوا بھاگا اور اور بھاگتا ہی چلا گیا۔

مغرور گوند اکڑتا ہوا خاموش آگے آگے راستے سے آگاہی کرتا ہوا بڑھا اور اس کے پیچھے نوعمر بچھڑے اور نازک تندرست چکنی مادینیں پٹھے اور شانیں پھڑکاتی، پیر جھٹکتی، گردنیں لچکاتی، بھڑکتی، ٹھٹکتی، کودتی، اچکتی آپس میں چہلیں کرتی بڑھیں اور اس طرح مالا کے گوندوں کی ڈاروں میں سے ایک ڈار سال بنی میں چلی۔ جس کے سامنے پڑ جانے والے چیتل، پاڑے سُوّر اور نیل گائے از خود راستہ چھوڑنے لگے۔ گوندوں کی ڈار نے زبردست نر کی حفاظت میں آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ سال بنی کے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈیڑھ میل چوڑائی کو پار کر کے موٹر روڈ کے قریب جنگل میں چھپی ہوئی ایک نمکیاری پر پہنچ کر بچے، پٹھے، بچھڑیں اور مائیں گڈھے کو چاروں طرف سے گھیر، گردنیں نیچی کر، وہاں کی نمکین مٹی چاٹ چاٹ کر مزے لینے لگے۔

بڑے نر نے کچھ دیر علیحدہ ہی کھڑے رہ کر جنگل میں چاروں طرف پھر نظر دوڑائی اور جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ سے بڑھ کر جھکی ہوئی مادینوں کے پیچھے ہی سے مٹی چاٹنے کو گردن بڑھائی تھی کہ سال بنی کے مالا کی طرف کے حصے سے دبی ہوئی آواز آئی "گُرر رر رر جھُر، پُر رر رر" گوند نے اور اس کی ساتھی ساری ڈار نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اندھیری رات اور پھر اندھیرا گھنا جنگل۔ جانوروں کے واسطے سُہانی روشنی سے پُر تھا۔ گوندوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پہاڑ ایسا ہاتھی دو سفید دانت اُن کی طرف دراز کیے، سونڈ لمبی پھیلائے اپنی آمد کی اطلاع ان کو دے رہا تھا۔

آدھے منٹ تک ہر گوند پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑا بغیر پلک جھپکائے اس سیاہ پہاڑ کو دیکھتا رہا پھر اکبارگی سب کے سب چونکے اور بے ترتیبی سے بھاگ پڑے بھاگتی ہوئی مادینوں نے ایک قطار بنا اس کے بیچ میں نر کو لے لیا۔

امن اور سکون کی حالت میں نر آگے آگے اُن کے واسطے راستے کے خطرات سے آگاہی کرتا چلتا تھا۔ لیکن بغیر راستہ دیکھے اور بغیر راستے کے حالات معلوم کئے بے تحاشا بھاگنے کی حالت میں نسل کا سلسلہ قائم رکھنے والے نر کی بجائے مادینیں خود اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر نر کو بیچ میں لے کر بچا لے جانے کے واسطے بھاگ پڑیں۔ یہی جنگل کے تمام چرندوں کا اصول ہے۔ البتہ انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ پاس لگی موٹر روڈ پر پہنچکر چلتی ہوئی ہوا کے مخالف جنوب مشرق کی طرف اپنا رُخ کر لیا۔ تاکہ اگر سامنے گھنے بن کے جنگل میں کوئی دشمن ہو تو اس کی بُو ان کو آ جائے۔

اور جب گوند بھاگ گئے تو نر ہاتھی نے ہلکی سی پیپ پُرر رو رو رو۔ بار لؤ کی آواز نکال کر پیچھے پیچھے آنے والے غولوں کو راستے کے محفوظ ہونے کی اطلاع دی۔ جس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیاہ تودے پنکھے ایسے کان اور اژدہے ایسی سونڈیں ہلاتے جابجا درختوں کے تنوں سے کتراتے ہوئے نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں نر، مادینیں اور بچے سب ہی تھے ہلتے جلتے پہاڑ چڑ پڑ، کھڑ بڑ ڈالیاں توڑتے، جھاڑیاں نوچتے۔ سونڈوں میں ڈالیاں گھماتے۔ ستون ایسے پیروں کو ہلاتے بڑھتے چلے آئے۔ اور موٹر روڈ کو پار کر کے اور دوسری طرف

کے بلّی کے جنگل میں گھس کر اس کے بیچ میں چھپی ہوئی پٹیلا جھیل کی طرف بلّیاں توڑتے، درخت چرچراتے، خوش ذائقہ پٹیلا کھانے کے لئے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ نرم پٹیلے کی بُو ان کو آنے لگی۔ ان میں سے ایک اسکاؤٹ نے آگے بڑھ کر گھنے ساکھوؤں میں سے سر نکال سبز لہلہاتے پٹیلا کے تختے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر سونڈ کی اُٹھی ہوئی نوک چاروں طرف گھمائی۔ کانوں کے پنکھوں کو ہر ہر طرف گردش دے کر آوازوں کا پتہ چلایا۔ اور جب سب طرح اطمینان ہو گیا تو اپنے غول کو بڑھنے کے واسطے ہلکے سے بگل میں اطلاع دی۔ "پیپ پررو رو رو رو۔ ہا۔ پو" ساتھ ہی غاؤں وآ آواعاں خوں"۔ شیر کے ڈانٹنے کی کرخت آواز آئی۔ زمین ہل گئی۔ جھاڑیاں لرزیں۔ درخت تھرائے۔ ہاتھی بری طرح گھنے پتلے بلّی کے جنگل کو توڑتے کچلتے واپس بھاگے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پچھلی رات کا چاند نمودار ہو کر اوس ٹپکاتے گھنے ساکھو کے سُتواں سیدھے درخت پر سے جھانکتا ہوا اپنی زائل ہوتی ہوئی ہلکی روشنی چھچھلی خشک جھیل میں اُگے ہوئے نیچے گھنے پٹیلے پر ڈال رہا تھا اور اونچے، گھنے، ساکت خاموش سیاہ جنگل سے چاروں طرف گھرے قدرے روشن پٹیلے کے ایک کنارے جنگل کی ٹٹیری بانس ڈیڑھ بانس اونچی پھرپھراتی ہوئی بول رہی تھی۔ "ٹٹ ٹیٹ، ٹیٹی۔ ٹیٹی۔ ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی، ٹیٹی، ٹیٹی"۔ لیکن جونہی شیرنی نامعقول ہاتھیوں کو ڈانٹ بتا کر اونچے درختوں میں سے نکلی ٹٹیری۔ "ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی۔ ٹیٹی" کی آخری چیخ بھرتی ہوئی پھیلے پیڑے کے شمال کی طرف نیچی نیچی اُڑتی چلی گئی اور وہیں غائب ہو گئی۔ دس فٹ لمبی دھاریوں دار شیرنی، خود لچکتی، دُم لچکاتی پٹیرے میں کچھ دُور گئی۔ اور پھر رُک گئی۔

وہاں سامنے جنگل سے سوا سو گز کے قریب، دُور پھیلے ہوئے پٹیرے میں شیرنی کے واسطے عجیب مسرت انگیز نظارہ تھا۔ شیرنی کے دو نوعمر بچے گوند کی ایک آدھ مری

کی ہوئی مادہ پر جھپٹے ہوئے تھے۔ ایک گری ہوئی مادہ کے پیٹھ کے پاس کھڑا ہوا اپنے دونوں اگلے پنجے اس کی کمر پر جمائے، برابر اٹھنے کی کوشاں گوند کو پھر گرا دیتا تھا۔ اور دوسرا موٹی گردن چھوٹے جبڑوں میں دبائے اپنی پوری طاقت سے اسی طرح جھٹکے دے رہا تھا جس طرح پورا شیر دو ہی جھٹکے دے کر گردن کی گرِبی گرِبی الگ کر دیتا ہے۔ شیرنی نے پہلے ہی سے اپنے بچوں کو شکار کی تعلیم دینے کے واسطے گوند کی گردن توڑ آدھ مرا سا کر دیا تھا۔ اس کا سر گردن پر جھول رہا تھا لیکن پھر ذبح کئے ہوئے مرغے کی طرح ڈگمگاتا سر اٹھا وہ اٹھ بھاگنے کی کوشاں تھی۔ جیسے ہی پیٹھ پکڑے گرانے والا بچہ ادھر سے کچھ ہٹ پٹھے پر منہ مارنے میں مشغول ہوا۔ لبمل گوند نے پھر زور کیا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ گئی۔ جو بچہ گردن میں چپکا تھا گردن میں لٹکنے لگا۔ گرفت چھوٹ گئی۔ جھٹ چار گز پیچھے ہٹ داؤں لگا، جست کے لئے دُبک گوند کے بھاگنے کا منتظر ہو بیٹھا۔ پٹھے پر کے بچے نے اگلے پنجے کے ناخنوں اور دانتوں کے کیلے وہیں گھسا دیئے تھے۔ جیسے ہی گوند ڈگمگاتی کھڑی ہوئی اُس نے پچھلے پیروں کے پنجے بھی اونچے کر کے ران پر جما لئے اور چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ بچہ گو تازی کتے کے برابر تھا لیکن گائے کے قد کی گوند کے واسطے اس کا وزن کیا چیز تھا۔ موت کے آخری جھٹکے، بھڑکے ہوئے گرم خون کا جوش! گ۔ ہ

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

خون میں لت پت، نتھنوں سے دھاریں چلتی ہوئیں، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گرتا ہوا، سر اٹھی ہوئی گردن پر۔ گوند دو نہایت مخدوش دولتیاں چلا کر دُلکی بھاگی۔

تماشا دیکھتی ہوئی شیرنی نے فوراً جہاں کھڑی تھی وہیں کے وہیں بدن سکیڑ سینہ اور پیٹ زمین سے ملا، چاہا کہ گوند پر جست کرے۔ لیکن بجلی کی طرح دوسرا بچہ ہوا میں معلق نمودار ہوا۔ اُس کی دم اور پیر پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔ اگلے ہاتھ گردن کے متوازی آگے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگتے ہوئے

گوند کی کمر پر گرا۔ دھماکے کی آواز آئی۔ گوند پھر زمین پر دراز ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ اور دونوں بچے پھر پچھلے پیروں کی زد سے بچے، اس پر جھپٹے ہوئے تھے۔ شیرنی نے اطمینان کا سانس لیا۔ سیدھی کھڑی ہوئی اور انتہائی غرور کے ساتھ آہستہ آہستہ بچوں کی طرف بڑھنے لگی۔

لیکن جنگل سے چاروں طرف گھرے ہوئے ٹیلے کے مغرب سے چلتی ہوئی ہوا میں بُو آئی اور پھر آہٹ ہوئی۔ قدم بڑھاتی ہوئی شیرنی اٹھا ہوا اگلا پیر اٹھائے ویسے ہی رُک گئی۔ نہ خود گھومی نہ سر گھمایا۔ ویسے ہی خاموش کھڑی رہی۔

ہلکی ہوا میں بُھکرا ہند کی بُو تھی۔ بھاری پیروں کے پھسا کے کی آواز تھی۔ پھر گستاخ بدتمیز ہاتھی اس طرف کی جرأت کر رہے تھے۔ ملکۂ دشت برہم ہوئی۔ آنکھوں میں بجلیاں، پنجوں میں خنجر بلاے خمدار نمودار ہوئے۔ گھومی ہوئی دم سیدھی پھیل گئی۔ خونخوار دہانہ زمین سے مل گیا اور دہاڑ! بھاری گھٹی ہر طرف پھیلی ہوئی دہاڑ نے چاروں طرف کے جنگلوں کو کپکپا دیا۔ شیرنی غلطی پر تھی۔ اس مرتبہ ہاتھیوں کا غول نہ تھا بلکہ صرف ایک ہی ہاتھی تھا۔ ایک کانا ہاتھی تھا۔ مست دیوانہ۔ ڈیڑھ دانت کا پہاڑ قامت۔ خونی اکڑ ہاتھی۔ وہ ہاتھی جو باجود آدھا دانت لڑائیوں کی نذر کر دینے کے تمام ہاتھیوں کو شکست دے چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو باوجود ایک آنکھ گولی سے ضائع ہو جانے کے تمام شکاریوں کو ہرا چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو دنیا کے تمام جانداروں سے برسرِ جنگ، ہر ہستی کے خون کا پیاسا پھرتا تھا۔ اس کے ساڑھے گیارہ فٹ کے قد میں نہ صرف بے اندازہ قوت پنہاں تھی بلکہ ڈیڑھ سو برس کی زندگی نے قوت کے اجتماع کے ساتھ ایک صدی سے اوپر کے تجربوں سے پُر! جابر، ظالم، بے رحم، چالاک اور مکار دماغ بھی اُسے عطا کیا تھا۔ وہ جس قدر جُثّے کا مالک تھا، اسی قدر اس وزن کے استعمال کرنے کے طریقوں سے بھی آگاہ تھا۔ شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ اُس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈھ کی نوک منہ میں دبائے ہوئے اور اٹھے ہوئے پچھلے ایک پیر سے دوسرا پیر کھجلاتے ہوئے سنی، اس کی بائیں

طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ جس میں سے دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے مستک پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی۔ اپنے دید سے خالی گڑھے پر مچپائی اور سالم آنکھ کے چھوٹے سے گول ڈھیلے نے چاروں طرف اوپر اور نیچے کئی چکر کھائے۔

کانا ہاتھی گھوما اور آہستہ آہستہ بغیر آہٹ کے واپس لوٹا۔ پیڑے سے قریب دوگنا دُور جاکر آہستہ سے دبی ہوئی "پُر دُرُو" آواز نکالی اور اس کے بعد گھنے ساکھو کے اندر ہی اندر پیڑے سے دُور ہٹتا ہوا، نصف دائرے میں چکر کھا، جھیل کے مغرب کی طرف پہنچ کر احتیاط سے دبے پاؤں کنارے کے پاس آکر ایک بہت موٹے درخت کی آڑ میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بے خبر شیرنی مری ہوئی گوند کو سر سے منہ میں اٹھائے، پیڑے سے سال بنی میں داخل ہوئی۔ بھاری گوند کو شیرنی نے اس طرح منہ میں اٹھا رکھا تھا جیسے بلی چوہے کو اٹھا لیتی ہے۔ البتہ اس کی گردن اور پیر لٹکے ہوئے زمین پر گھسٹ رہے تھے اور دونوں بچے گھسٹتے ہوئے اعضا کو کبھی ادھر سے اور کبھی ادھر پکڑ کر گھسیٹتے اور جھٹکے دیتے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ شیرنی ان کی اس بے موقع کارگزاریوں سے قدرے جھنجھلائی، ہلکے ہلکے غراتی دائیں بائیں کتراتی۔ اونچے سال بنی کے نیچے چھدری اگی ہوئی جھاڑیوں میں چلی آرہی تھی کہ دفعتہً اس کو درختوں کے چار تنے اپنی جگہ چھوڑ تیزی سے حرکت کرتے معلوم ہوئے اور قبل اس کے کہ وہ گوند کو رکھ کر اوپر دیکھنے کو سر اٹھائے ایک تیز تر بھیانک چنگھاڑ سے کان کے پردے تھرتھرانے لگے۔ شیرنی کی اٹھتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑے ہوئے ہاتھی پر گزوں اٹھتی چلی گئیں۔

شیرنی نے دیکھا وہاں سیاہ بے ہنگم بھوت گزوں اونچے سر سے بھی گزوں اونچی سونڈ اٹھائے دیوار کی طرح سامنے کھڑا، اٹل، جنگ کا پیغام دے رہا تھا۔ شیرنی کے سامنے اس کا شکار اور دائیں بائیں اس کے نوعمر اور ناتجربہ کار بچے تھے۔ خطرہ اور فوری خطرہ سامنے تھا۔ خون میں ہیجان آیا۔ رگیں تھرائیں، پٹھے سکڑے اور آناً فاناً ہیں، قہر کا شعلہ تھا کہ جرأت کی بجلی تھی، جو زمین سے چھٹی اور پہاڑ ایسے دشمن کی بانسوں اٹھی ہوئی سونڈ تک پہنچی۔ ہوا میں معلق شیرنی چاہتی تھی کہ گرفت میں لاکر اس اٹھی ہوئی سونڈھ

کو جبڑوں سے چبا ڈالے اور پنجوں سے چیر چیر کر ڈالے لیکن اٹھی ہوئی سونڈھ کے اژدہے نے ناگن کی طرح بل کھایا۔ موت کا سیاہ لٹھا سامنے سے لپکا، بازو میں آیا اور کئی من کا مُکا شیرنی کی پسلیوں پر گھم سے پڑا۔ بھد سے شیرنی زمین پر گری، ہاتھی لپکا۔ سیدھے پیر کی دنا کن ٹھوکر چلائی، مگر وہاں جگہ خالی تھی۔ پھرتی کا مجسمہ شیرنی کندھے پر جمپٹی، سخت کھال میں دانت اور ناخن گھسا رہی تھی۔ ہاتھی نے جھرجھری لی اور دو جھٹکے اپنے بدن کو اس قدر سخت دیئے کہ شیرنی کی گرفت چھوٹ گئی۔ وہ پھر تین گز پر گری اور ساتھ ہی کچل کر نقشِ زمین کر دینے والا سولہ من کا پیر اسٹیم ہیمر کی طرح اس جگہ پڑا جہاں شیرنی گری تھی۔ مگر پھرتیلی شیرنی ہٹ چکی تھی اور خیال کی تیزی کے ساتھ اب کے پُٹھے کو بھنبھوڑ رہی تھی۔ ہاتھی نے پھر اپنے بدن کو سخت جھٹکے دیئے۔ لیکن بیکار۔ شیرنی نے دانتوں کے پیش قبض اور ناخنوں کے نشتر سخت کھال میں انچوں پیوست کر دیئے تھے۔ ہاتھی باوجود کرب اور تکلیف کے لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔ پھر اطمینان کے ساتھ نصف دائرے میں گھوما۔ تنہا مکّار آنکھ نے اپنا کام کیا۔ ایک زبردست درخت کو تاک لیا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسکا۔ اور پھر قریب پہنچتے ہی پھرتی سے جھپٹا۔ چار فٹ موٹے درخت کے تنے اور سینکڑوں من بھاری ہاتھی کے جسم کا ایک شکنجہ تھا جس کے بیچ میں شیرنی کی ہڈیاں اور پسلیاں چرچرا رہی تھیں۔ آخری جانگسل چیخ شیرنی کے منہ سے نکلی۔ جنگل گونج گیا۔

کانا ہاتھی بڑی دیر تک شیرنی کی لاش کو درخت اور اپنے جسم سے دبائے رگڑ رگڑ کر کچلتا رہا۔ اور جب بالکل ہی اطمینان ہو گیا تو شیرنی کی چپٹی لاش کو پہلے پیروں سے ٹھکراتا رہا۔ اور پھر پیر سے دبا اور سونڈھ سے پکڑ چاروں ہاتھ پیر چیر چیر کر اِدھر اُدھر اُچھال دیئے۔ اور اس پر بھی جب جلال کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لوتھ دھڑ کو فٹ بال کی طرح ٹھکراتا ہوا سال بنی کے مشرق کی طرف چل دیا اور مزروعہ سے ملے۔ جنگل کے کنارے کٹان کے ایک ٹکڑے پر پہنچ گیا۔ جہاں کٹان اور سلیپر چران کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔ دو تین درخت گرائے جا چکے تھے اور دو تین آرہ کش بھی آگر شگون کے طور پر کام شروع کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ ابھی پوری طرح مدد نہ آئی تھی، اس لئے یہاں کانے ہاتھی کو برباد کرنے کے واسطے چند نامکمل منڈتیوں کے

علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ یہ ان ہی کو دل بھر کر روندنے کے بعد تھوڑا سا پھونس سر پہ اُچھال اور اور تھوڑا پھونس مُنھ کے ایک کونے میں دبا۔ چھپروں کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی سونڈھ میں لے آگے مزروعہ میں لہلہاتے گیہوں چرنے چل دیا۔

ہر شب کے معمول کے مطابق دس بارہ میل کی چہل قدمی کے بعد چران کے ٹکڑے سے نکل کانا ہاتھی صبح تین بجے کے قریب بیپر یا گاؤں کے جنوب کی طرف جنگل کے کنارے آنکلا۔ جنگل سے باہر زمین مزروعہ کے کنارے کنارے میلوں لمبی کانٹے دار ڈالیوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے بنائی ہو دیوار اس کے واسطے کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔ سونڈھ ڈال کر آہستہ سے جھانکڑ کی دیوار گزوں کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ اور پھر گز بھر اونچے ہرے لہلہاتے گیہوں میں کھڑے ہو ہو کر ایک ایک وقت میں دبوچ دبوچ کے پودے سونڈھ میں لپیٹ جھر جھر جڑوں سمیت نوچنا شروع کر دیئے اور ان پولوں کو سونڈھ میں ہلا ہلا کر اگلے پیر مارتے ہوئے جڑوں کی مٹی جھٹک کر دوہرا کر کے منہ میں رکھنا اور مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ اس قدر خودی کے گھمنڈ میں کھویا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر پیشتر شیرنی کے ہلاک کرنے کے کارنامے کو بھی اپنی طاقت کا ادنیٰ کرشمہ سمجھے ہوئے ایک معمولی واقعہ کی طرح فراموش کر دینے کا کوشاں تھا۔ وہ دنیا کی تمام طاقتوں سے بے خوف کھیت میں کھڑا گیہوں کے پُولوں پر پُولے نوچتا، جھٹکتا اور چرچر کھاتا چلا جا رہا تھا، اس کے پیروں میں اور اس کی پشت پر گزوں کھیت سبز گھنے پودوں سے خالی ہو کر پیروں کے گول گول گڑھوں سے کھُند چکا تھا۔

شامت جو آئی تو اُس سے کچھ دُور مچان پر سوئے ہوئے ایک رکھوالے کی آنکھ کھل گئی۔ چرمر جھر آوازیں سنیں سمجھا کہ سُور گھس آئے ہیں۔ صبح ہونے کو تھی۔ سردی پڑ رہی تھی۔ رضائی اور کملیاں لپیٹا پڑا تھا۔ ویسے ہی پڑے پڑے آواز لگائی۔ "دھوالا لالا۔ دھو آ آ۔" اور پھر خراٹے لینے لگا۔

مکار ہاتھی اس آواز کے سنتے ہی سُن ہو کر رہ گیا۔ کئی منٹ آدھا پولا منہ میں

اور آدھا سونڈھ کی نوک میں پکڑے کھڑا رہا۔ پھر پُولا منہ سے نکال وہیں پھینک سونڈھ کی نوک بُو لینے کو آگے بڑھائی۔ کان کھڑے کئے اور آہستہ آہستہ مچان کی طرف بڑھا پاس پہنچ کر پھر خاموشی سے خراٹے سنے۔ ایک ایک قدم کر کے مچان تک گیا۔ لمبی سونڈھ اٹھا کر مچان پر رکھی۔ آہستہ سے سوتے ہوئے آدمی کے پیر مع لحاف کمبل اور گاڑھے کی سوزنی کے لپیٹ کر سڑ سے اُسے کھینچ لیا۔ ہوا میں دو بڑے بڑے جھکولے دے کر سڑاسڑ دو دفعہ زمین پر پٹکا اور پھر پیر میں دبا کر چراچر لحاف کمبل وغیرہ چیر ڈالے۔

آدمی ان میں اب نہ تھا۔ وہ پہلے ہی جھکولے میں تکیہ کی طرح اپنے غلاف میں سے نکل دُور جا گرا تھا۔ شکاری کلوا پاسی کا لڑکا بدّل گو ابھی نوجوان ہی تھا لیکن بچپنے سے اب تک جنگل کے آغوش میں رہا تھا۔ نو دس برس کی عمر سے شکاریوں کے ساتھ جانے اور جنگل میں مویشی چرانے سے اس کے حواسِ خمسہ حواسِ عشرہ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جیسے ہی ہاتھی نے اپنی سونڈھ میں لپیٹ کر اس کے پیر کھینچے کسی نامعلوم حِس نے اس کو خطرے کی اہمیّت سے آگاہ کر دیا۔ اُس نے سانس کھینچ لیا۔ بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور جب وہ بستر کے خول میں سے نکل بھد سے کھیت سنچائی کی دلدل میں گرا تو اس نے چوں نہ کی۔ بلکہ ویسے ہی بے حس پڑا ہر ہر آواز کو غور سے سنتا رہا۔ جھراجھر کپڑوں کے چیرنے اور پھاڑنے کی آوازیں سنیں پھر پُھنکار سے ملتی اطمینان کی سانس سنی اور اس کے بعد پیروں کے پھساکے سُنے اور جب یہ پھساکے کافی دُور سے آنے لگے تو پھر کیچڑ میں اوندھے پڑے ہی پڑے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں کے بَل اونچے ہو کر صبح کی ہلکی روشنی میں سیاہ دَل، دیو قامت ہاتھی کو جنگل میں گھستے اور غائب ہوتے دیکھا۔

جب یہ کسرتی گبرو جوان کیچڑ میں پڑے ہی پڑے ہاتھوں کے بل اگلا دھڑ اٹھائے ہوئے گیہوں کے پودوں کے اوپر سے ہاتھی کو دیکھ رہا تھا تو وہیں اس کے پچاس قدم پیچھے منڈیر پر کھڑا ہوا ایک اور گاؤں کا لڑکا جُھلئی اس کا تماشہ دیکھ رہا

تھا۔ اس ہم عمر، کمزور، بزدل اور مکّار جھلئی نے مسکراتے ہوئے آواز دی۔ "ارے دادا تم اِتّے لگے ہو۔ آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔ نکس آؤ۔ میں ٹھاڑا ہوں۔"

بدّل نے سر گھما کے جھلئی کو دیکھا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ گو کمر میں سخت جھٹکے کی وجہ سے بہت تکلیف تھی۔ لیکن فوراً۔ "ٹھاڑا رہیو آت ہوں" کہتے ہوئے بڑی تیزی سے مشتہر کرنے کے لئے گاؤں کی طرف روانہ تھے۔

جوں توں بہادر بدّل گاؤں پہنچ گیا۔ کمر کی مالش کی گئی۔ سکائی ہوئی دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بے کار.... بدنامی اس کی ہو چکی تھی جس کا علاج اس کے پاس نہ تھا۔

چونکہ میجر بُوسٹ کچھ عرصہ افریقہ میں رہ چکے تھے۔ اور چوں کہ اُن کی محبوبہ منگیتر لوئس سے غرور سے مسکراتی ہوئی حاضرین کی طرف دیکھ دیکھ اُن کے قصّے سنایا کرتی تھی۔ اس لئے میجر بوسٹ کے لئے کلب میں بیٹھ کر افریقۂ اعظم کے بے پایاں جنگلوں میں مہیب وحشی جانوروں کے خطرناک شکار کے قصّے بیان کرنا ضروری تھے جن کے سننے سے دل کانپ جائے۔ رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور عقل خبط ہو جائے۔ اور جب ایسا ہوتا ہی تھا تو ایک دن ایسا بھی ہوا کہ ٹھیک اس وقت جبکہ میجر ہاتھیوں کے شکار کا ایک ایسا واقعہ جس میں اُن کے دو بندوق بردار حبشی قلی چھ کے چھ ہاتھیوں کے پیروں میں روند کے اور سونڈوں سے چر کے ختم ہو گئے تھے۔ بیان کر ہی چکے تھے اور آٹھ دس حاضرین جن میں دو اور لیڈیز بھی تھیں، ششدر خاموش بیٹھے تھے تو ایک نوعمر لفٹنٹ نے اٹھ کر جیب میں سے "ٹائمز آف انڈیا" کا تہہ کیا ہوا ایک صفحہ نکالا اور اسے اطمینان سے کھول کر سیدھا کیا اور پھر کہا۔ "آپ لوگ سنیں، پرسوں کے اخبار میں ایک اشتہار تھا۔ شاید آپ لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو۔" اس نے کنزرویٹر آف فارسٹس یو۔پی کا وہ اشتہار پڑھا۔ جس میں پیلی بھیت ڈویژن کے کانے خونی ہاتھی کے مارنے پر پانچ سو روپے کا انعام مشتہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن میجر بوسٹ مع اپنی چھ بندوقوں اور چار ملازموں اور تین بیل گاڑی سامان کے، ملازموں کو ہندوستانی کتا کہتے، خود سفید فاکس ٹیریئر کی زنجیر تھامے مالا اسٹیشن پر اترے۔ حسبِ ہدایت از افسرانِ بالا فارسٹ گارڈ مع قلیوں اور بیل گاڑیوں کے موجود تھا۔ اسٹیشن سے سامان لادا گیا اور جنگل کی کوٹھی میں اتار دیا گیا۔ جہاں صاحب بہادر نے تمام تر اطمینان اور آسائش کے ساتھ سکونت اختیار کر لی اور صبح سے شام تک اسپراگس، سارڈین، ساسیجز، فروٹ سیلڈ سینڈوچز، کریم وغیرہ ایسے اقسام کے ڈبے کھلنے اور خالی ہو ہو کر پھکنے لگے اور دودھ، انڈے مرغی، تازہ مچھلی، ڈبل روٹی اور ڈاک کی فراہمی کے واسطے طرح طرح کے پیادے اطراف میں دوڑنے لگے۔ اور میجر بوسٹ خود اخبار پڑھنے، خطوط دیکھنے، ان کے جوابات لکھنے، شیو کرنے، بال بنانے، کئی کئی غسل کرنے اور متعدد لباس پہننے ایسے اہم مشاغل جن میں کہ بار بار کے ناشتے اور کھانے بھی شامل تھے مصروف ہونے کے باوجود صبح اور شام ایک دو گھنٹے شکار کے واسطے نکال کر اکثر چگتی ہوئی مرغیاں اور جنگل میں سے جھانکتے ہوئے چیتل مارنے لگے۔ اسی طرح آٹھ دن گزر گئے اس عرصہ میں ایک دن ایک کالا تیتر بھی انہوں نے مار لیا تھا۔ اور کوٹھی سے چار میل کے فاصلہ پر ایک کھیت میں مہینہ بلکہ سوا مہینہ پرانے ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی دیکھ آئے تھے۔ غالباً شکار کے لحاظ سے میجر بوسٹ کی سرگرمیاں بس اسی حد تک محدود رہتیں اور چار دن اور گزر جانے کے بعد وہ پھر ایک دفعہ ڈیم فول کی بوچھاریں نجی نوکروں، فارسٹ گارڈوں اور ریلوے ملازموں پر اڑاتے ہوئے مالا اسٹیشن سے روانہ ہو کر بریلی پہنچ جاتے۔ لیکن اتفاقاً بدل کو پتہ چل گیا کہ ایک لال کرتی کا لال منہ والا صاحب کوٹھی میں شکار کھیلنے کے لئے ٹھہرا ہے۔ یہ تو خار کھائے بیٹھا ہی تھا۔ دوسرے ہی دن صبح چار بجے بلّم ہاتھ میں لے گھر سے چل دیا اور مالا ندی کے کنارے کنارے پیروں کے نشان دیکھتا ہوا میلوں نکل گیا۔ دن چھپے گھر واپس آیا تو باپ نے پوچھا۔ "ارے کہاں رہا رے؟"

بدّل بولا۔ "کوٹھی میں جو صاحب ٹھہرا ہے اس نے شکار کھلانے کو رکھ لیا ہے۔ مرغی، جھانک مارتا ہے۔"

اب صرف اس امید پر کہ شاید ان ایام میں کانا ہاتھی پھر اس طرف نکل آئے یہ روزانہ مالا کے کنارے کنارے کھوج میں روانہ ہو جائے۔ آخر چوتھے روز گاؤں سے چار میل کے فاصلہ پر کانے ہاتھی کا کھوج مل ہی گیا۔ یہاں پھر اس نے پچھلی رات کھیت چرے تھے اور صبح ہوتے تین میل چوڑے جنگل میں سے ہو کر مالا ندی میں گھس گیا تھا۔ جہاں کسی نہ کسی ٹاپو میں دن بھر قیام کر کے دوسری رات پھر کسی اور طرف نکل جانا اس کے واسطے ضروری تھا بدّل اس کا کھوج پاتے ہی بھاگتا ہوا گاؤں واپس آگیا۔ یہاں آ کر زمیندار کی گھوڑی نظر آگئی جھٹ پٹ نمکی اس پر کس، سوار ہو۔ سیدھا پھر کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ سرپٹ گھوڑی دوڑاتا جس وقت کوٹھی پر پہنچا تو دس بجے کا وقت تھا۔ صاحب بہادر بندوقیں، جھولے، تھرماس، دوربین، کیمرہ وغیرہ ایسی ہی ضروری چیزیں ہاتھی کے شکار کے واسطے تین مزدوروں پر لادے ہوئے روانہ ہو رہے تھے اس نے جاتے ہی دوہرے ہو کر ہاتھ زمین سے لگا کر سلام کیا اور کہا کہ کانے خونی ہاتھی کو میں تلاش کر کے آیا ہوں۔ اب دیر نہ کی جائے، فوراً چلا جائے۔ لیکن صاحب بہادر نے باوجود اس کے جلدی مچانے کے آدھا گھنٹہ پوچھ گچھ میں لگا دیا۔ "کے ہاتھی ہیں؟ کانا ہاتھی بھی اُن میں ہے؟ کیسے جنگل میں ہیں؟ اس جنگل میں ایسے مضبوط درخت بھی ہیں جن پر چڑھ کر نشانہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتنی دُور جانا ہے؟" وغیرہ سوالات کئے۔ بدّل شکاری کی صورت اور سامان دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کس قسم کا شکاری ہے۔ لیکن پھر بھی لال کرتی کا بریلی کا صاحب تھا۔ اس کی بھاری بھاری بندوقوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس نے جھوٹے سچے جواب دے کر صاحب بہادر کو فوراً چلنے پر راضی کر لیا۔ صاحب گھوڑی پر سوار ہوئے۔ ۴۰/۳۲ بور کا رائفل بدّل کو دیا گیا اس کا بھرنا چلانا بتایا گیا دوسرے ڈو اور جوڑی کے ڈبل بیرل ۴۵۰ بور ایکسپریس رائفل دو اور مزدوروں کو دیئے گئے۔ اور یہ لوگ گھوڑی کے آگے اور پیچھے کبھی بھاگتے اور کبھی تیز قدم چلتے ہوئے روانہ ہوئے۔ بدّل نے میل ہی بھر کے بعد جنگل کا کنارہ پکڑ لیا اور اس طرح گاؤں کو

اُلٹے ہاتھ پر چھوڑ کر جنگل ہی جنگل لئے چلا جا رہا تھا۔ ابھی اس کو تین میل اور جانا تھا کہ اب صاحب بہادر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ بہت ہی زیادہ بگڑ کر دریافت کیا کہ "آخر کہاں تک چلنا ہوگا؟"

وہ ابھی تک اسی خیال میں تھے کہ میل دو میل کی بات ہے۔ اُس کے اختتام پر کالے ہرن کی طرح نشانہ بنا کھڑا ہوا ہاتھی آجائے گا۔ چاند ماری کے معرکہ آرا، صاحب بہادر دُور ہی سے اُسے دیکھ کر پٹ سے گرا لیں گے۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی نکلا۔ اور جب اس دوش کو پورا کر چکے تو پہنچے کہاں ہاتھی کے پیروں کے نشانوں پر۔ اب جنگل میں گھسنے کی باری آئی۔ صاحب بہادر لگے ہاتھ پیر پھیلانے اور سوالات کرنے۔ بدل نے پھر سبز باغ دکھائے کہ بس اب کیا ہے۔ آ پہنچے ہیں۔ مار لیا سالے کو۔ غرضکہ ایک آدمی تو گھوڑی لے کر گاؤں واپس بھیجا گیا اور باقی دونوں کے ساتھ اب پیدل چلائی شروع ہوئی، آگے آگے بدل، بیچ میں صاحب، پیچھے تلی، پھر تیز تیز روانہ ہوئے۔ ایک ٹکڑا سال بنی کا آیا، دوسرا آیا۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ تیسرا شروع ہوا۔ راستہ نہ آج ختم ہوتا ہے نہ کل۔ ہاتھی کا محلہ ہی نہیں آتا۔ شروع میں تو سال بنی میدان کی طرح نیچے صاف تھی، پھر فٹ، ڈیڑھ فٹ اونچے پودے جھاڑیاں گھانسیں شروع ہو گئیں اور اب تو یہ حال تھا کہ اونچے سال کے درختوں کے نیچے اُگی ہوئی جھاڑیاں سر سے فٹوں اونچی تھیں۔ تین چار گز سے آگے کا کچھ نظر آنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ اب میجر بوسٹ کی یہ حالت تھی کہ نہ آگے بڑھتے سمجھ میں آتا تھا نہ لوٹتے۔ ہر لمحہ اور ہر طرف سے ہاتھی کی سونڈھ پتوں میں سے نکل کر ان کو دبوچتی معلوم ہوتی تھی اس پر غضب یہ تھا کہ بدل بڑے ہی اطمینان بخش لہجہ میں صاحب کو یقین دلاتے جاتے تھے کہ بس اب تو بالکل نیگیچ (نزدیک) ہے ہاتھی۔

خدا خدا کر کے دفعتہً یہ جنگل ختم ہو گیا۔ سامنے مالا ندی کا بھوری گھانس سے پٹا ہوا چوڑا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں کہیں کہیں گہرے سبز جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ٹاپو دکھائی دے رہے تھے۔ ندی کے کگارے کے نیچے ہاتھی چھپوا بھوری گھانس سنسناتی معلوم ہو رہی تھی۔ پشت پر گھنے جنگل میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔

اور اس میں سے رُک رُک کر گُٹ۔ کُٹ۔ کِٹ۔ کِٹ۔ کُٹ۔ کُٹ۔ کھُٹ۔ کھُٹ بڑھئی کی آواز آرہی تھی دن ڈھلنا شروع ہوگیا تھا۔ دو بجے کا وقت تھا۔ یہاں تینوں دم لینے کو ٹھہرے۔ میجر بوسٹ نے انتہا سے زیادہ لال منہ کا پسینہ بار بار پونچھتے ہوئے آگے کی گھانس اور پیچھے کے جنگل کو بُری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شکاری تھیلے میں سے برانڈی کی چھوٹی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ لئے لمبی سانس لی۔ اور پھر چند گھونٹ لئے۔ سگار نکالا، اس کو جلایا، دس بیس کش اس کی لئے جب جاکر پھر چلنے پر آمادہ ہوئے۔ اب روانہ ہونے سے پہلے بدل نے صاف بتا دیا کہ بس اس گھانس کے اندر جس ٹاپو میں یہ پیر کے نشان گئے ہیں، وہیں ہاتھی ہوگا۔ ہوشیار رہنا۔ پھر وہی آگے آگے بدل، بیچ میں صاحب، پیچھے مزدور۔ ایک دونالہ ۴۵ بور رائفل صاحب کے ہاتھ میں، دوسرا بھرا ہوا پیچھے مزدور کے ہاتھ میں۔ ہاتھی کے پیروں سے کھدی ہوئی گھاس کبھی خشکی کبھی پانی اور کبھی کیچڑ! چل پڑے۔ گھانس کا گھن اور اونچائی ایسی تھی کہ اس میں غرق ہو گئے۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ گدلے پانی میں ڈبکی لگا کر اندر ہی اندر جا رہے ہیں۔ اپنے سے ایک فٹ بھی اِدھر اُدھر حتیٰ کہ اوپر بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جوں توں اس گھانس کے سمندر کو پار کیا۔ وہ ٹاپو۔ یہاں پھر ایک دفعہ گھنا سرسبز جنگل فرنوں اور پھولوں سے آراستہ آگیا لیکن اب اس کا گھن اس بلا کا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے سے صاحب نے قطعی انکار کر دیا۔ اور پھر جبکہ یہ بات بھی یقینی تھی کہ خونی ہاتھی مزدور بالضرور اسی چھوٹے ٹاپو میں ہے عقل نے آگے بڑھنا گوارا ہی نہ کیا۔ دل کی حرکت آٹھ روپے گز اُونی سن پروف سرج کو عبور کر کے ظاہر ہونے لگی۔ صاحب بہادر دونوں ٹانگیں چیر کے ثابت قدمی سے وہیں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دونوں ڈبل بور بھرے ہوئے رائفل سامنے درخت کے تنے سے لگا کر کھڑے کر دیئے۔ اپنے مقدر کو کوسا، اپنے کو کوسا، بدل کو انگریزی زبان کی تمامتر گالیاں بخشں اور جھولے میں سے سگار اور برانڈی کی بوتل نکال کر دونوں کا استعمال شروع کر دیا۔ جبکہ یہ سگار کے لمبے لمبے کشوں کے درمیان برانڈی کی بوتل میں سے چھوٹی چسکیاں لینے میں مصروف تھے۔ بدل

کے واسطے سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا کہ وہ چکّی کے پاٹ جیسے ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کو کچھ دیر حسرت سے دیکھنے کے بعد ایک دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کا خیال ہرگز زیادہ دُور جانے کا نہ تھا محض شغلِ بیکاری، وہ ٹہلتا ٹہلتا پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ یہ نشان قریب پچاس گز گھانس سے جنگل کے اندر جانے کے بعد پھر گھوم کر ندی کے کنارے کے متوازی ہو گئے تھے۔ بدّل انہیں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا کہ اُسے خیال آیا کہ وہ دُور نکل آیا ہے۔ واپس جانا چاہیئے اس لئے اس کے نشانوں کو چھوڑ کر ندی کے کنارے کی طرف رُخ کیا۔ جھاڑیوں اور پتوں کا گھن بلا کا تھا مگر یہ جھکتا اور بیٹھے بیٹھے کھسکتا، اُن کے نیچے نیچے سے نکلتا پھر ندی کے کنارے نکل آیا۔ لیکن جیسے ہی ریتیلے اور قدرے کشادہ کنارہ آیا، اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہاں بالکل ہی تازے ہاتھی کی واپسی کے پیروں کے نشان تھے۔ گویا ہاتھی اسی وقت اس راستہ سے صاحب کی طرف گیا ہے۔ بدّل نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سو گز صاحب سے دُور ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی ہی ۴۰/۴۲ مارٹینی اکش ونچسٹر رائفل کا لیور نیچے کھینچ کر مزید اطمینان کیا کہ کارتوس نال میں ہے، اور پھر لیور چڑھا کر رائفل دونوں ہاتھوں میں تانے واپس بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے جیسے ہی وہ بید کی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلا، سامنے صاحب ایک ہاتھ میں بوتل دوسرے ہاتھ میں سگار لئے، آنکھیں بند کئے مُنہ سے دھواں نکالتے نظر آئے اور ساتھ ہی اپنے اور صاحب کے درمیان جنگل کی آڑ میں اُن کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھی بھی دکھائی دیا۔

مکّار ہاتھی بے خبر شکاری کی طرح چھپا ہوا دبے قدم بڑھ رہا تھا۔ اب چند ہی قدم اور آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ بدّل نے ایک بھیانک چیخ مار کر صاحب کو ہوشیار کیا۔ کانا ہاتھی اس آواز پر بجلی کی سرعت کے ساتھ گھوما اور اس نئے چلّانے والے دشمن پر جھپٹا۔ اب بدّل کے واسطے سوائے مقابلے کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ "مارو صاحب مارو"۔ کہتے ہوئے اس نے

بندوق کاندھے پر چھپائی۔ دھڑسے فیر کیا۔ فوراً پھر نیچے کی مٹھی میں پانچ کارتوس اور تھے۔ بندوق بھری اور پھر فیر کیا۔ پھر بھری اور پھر فیر کیا۔ ہاتھی کی چھ انچ موٹی ماتھے کی ہڈی پر یہ گولیاں ٹھسا ٹھس پڑتی اور پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ تاہم اس تکلیف دہ مذاق سے گھبرا کر رُک گیا۔ لیکن اب بدّل کا آخری کارتوس خالی ہو کر نال سے گر چکا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر اس طرف دیکھا جہاں صاحب بہادر کھڑے تھے پھر اُس نے مڑ کر گھانس کے کنارے کی طرف دیکھا جس میں صاحب بہادر گھس کر غائب ہوتے ہوئے اُسے دکھائی دیئے اور اس کے بعد اس نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ ہاتھی کے ایک ہی مُکّے میں یہ گرا اور تین فٹ موٹے پیر کی ایک ہی داب میں کچل کر جیتے جاگتے نوجوان انسان سے ہڈیوں، گوشت اور چھیچڑوں کا مٹی ملواں ڈھیر ہو گیا جس کو ٹھکرا ٹھکرا کر اور نوچ نوچ کر ہاتھی نے اور بھی زیادہ ناقابلِ تصور شیرازوں میں بکھیر دیا۔

میجر بوسٹ کا دوسرا ساتھی ان سے پہلے رفو چکر ہو گیا تھا۔ تنہا صاحب بہادر جن مصیبتوں سے مالا کی کوٹھی تک واپس آئے ہیں بس اُن ہی کا دل جانتا تھا۔ تاہم خوش تھے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔ کارتوسوں کا جھولا اور دونوں میں سے ایک رائفل وہیں رہ گیا تھا۔ جھولے کا تو خیر کچھ نہیں۔ لیکن جوڑی کے رائفل قیمتی تھے۔ جو چھوڑ آئے تھے۔ اس کی فکر تھی۔ اس لئے دوسرے دن محکمۂ جنگلات کو بدّل کے دونوں ۴۰/۳۲ اور ۴۵۰ بور رائفل لے کر فرار ہو جانے کی یا گم ہو جانے کی باقاعدہ اطلاع دے کر صاحب بہادر اینٹھتے، اکڑتے، چیختے چلاتے بریلی روانہ ہو گئے۔

ان کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد بدّل کا بوڑھا باپ کلوا پاسی، بلّم کندھے پر رکھے، پریشان گھبرایا ہوا کوٹھی پر آیا اور بڑی دیر تک سونی کوٹھی کو دیکھتا رہا۔ آج یہاں چوکیدار بھی نہ تھا جس سے وہ کچھ دریافت کرتا۔ آخر ایک لمبی سانس لے کر

وہ پھر واپس لوٹ پڑا اور سیدھا جنگل کی طرف چل دیا۔

صبح دس بجے سے آہیں بھرتا سر نیچا کئے پھرتے پھرتے آخر شام کے پانچ بجے ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا جہاں یہ لوگ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مالا ندی کی گھانس میں گھسے تھے۔ جیسے ہی اُس نے کانے ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھے اور اُن ہی کے برابر فوجی فل بوٹ اور بدل کے نالدار چمڑوے جوتے کے نشان بھی پائے یہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور "ہائے بھگوان جو کا ہے بھگوان"۔ ہاتھوں میں سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر ایک بارگی "بدل، بدل۔ ارے لل لہ آت ہوں" کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اور نہایت تیزی سے گھانس میں روانہ ہو گیا۔ گزوں اونچی گھانس میں سُرنگ ایسا بے ترتیب راستہ کچلی ہوئی گھانس، کیچڑ اور دلدل میں بنا تھا جہاں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی کلوا اسی پر آنکھیں گاڑے چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ میجر بوسٹ کی واپسی کا نشان اُسے نظر آ گیا تو اس وقت باپ کی محبت نے عقل کو خبط کر دیا۔ اس نے بے اختیار آواز لگائی۔ "بدل رے بدل آت ہوں لل لہ"۔ سنسناتی ہوئی گھانس میں آواز بھر بھرائی۔ اور پھر خاموش ہو گئی۔

اب کلوا مجنونانہ وار اس گھانس کی اندھیری گلی میں بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ گھانس ختم ہو گئی۔ وہ جنگل کے کنارے پر پہنچا۔ اور اندر داخل ہونے ہی کو تھا کہ دفعتاً بائیں ہاتھ کے نشانوں کی طرف گھوم پڑا۔ دس قدم اور گیا ہو گا کہ ششدر کھڑا ہو گیا۔

سامنے ہاتھی کے پیروں کی کھوندن تھی۔ جا بجا سوکھے ہوئے خون کے سیاہ دھبے اور چھپکے تھے۔ انسانی جسم کے کئی ایک روندے کھوندے مٹی میں لت پت مکھیاں بھنکتے بد بو دار ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ بندوق کی ایک پتلی نال خم کھائی ہاتھی کے پیر کے گڑھے میں دھنسی پڑی تھی اس سے کچھ دور چمڑودے جوتے کے پاس ہی بندوق کا کندا ٹوٹا پڑا تھا۔

اس نظارے نے کلوا پاسی کو باپ کی حیثیت سے ہٹا کر ایک دفعہ پھر پرانے تجربہ کار شکاری میں تبدیل کر دیا۔ جوان بیٹے کی موت کا تعلق سردست ملتوی ہو کر موت کے

واقعات کی جستجو میں سارا دھیان لگ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ نہایت غور سے ایک ایک نشان کو اور ایک ایک گری پڑی چیز کو دیکھنا شروع کیا۔ پانچ عدد ۴۰/۳۲ بور کے پیتل کے خالی کارتوس۔ خون کے سب سے بڑے دھبّے کے قریب سے ایک ایک کر کے بینے، پھر رائفل کی زمین میں دھنسی ہوئی ٹیڑھی نال کو نکالا۔ مٹی چھڑائی۔ نال میں دیکھا تو چلا ہوا ایک کارتوس اب بھی موجود تھا۔ اس نے ایک پکے شکاری کی طرح داد دی۔ "ساباس، ساباس" بھاگا نہیں، ڈٹا رہا۔ گولی کھتم ہوئے گیئں تے بھی ڈٹا رہا۔" اسی طرح بُڑ بُڑاتا ہاتھی کے پیروں پیروں چلا۔ اس جگہ پہنچا جہاں پر سے ہاتھی صاحب کو چھوڑ بدل کی طرف گھوما تھا۔ یہاں اس نے یہ دیکھا کہ ہاتھی اپنے بائیں طرف جب بدل رُخ میں گھوما تھا۔ تو ٹھیک بدل کی ہی سمت نہیں گھوما تھا بلکہ کچھ زیادہ گھوم گیا تھا۔ اور پھر کچھ اُلٹا گھوم کر قدرے سیدھا رُخ کر کے، لیکن اب بھی کچھ دایاں رُخ لئے ہوئے بڑھا تھا۔ کلوا بڑبڑایا۔ "الٹی آنکھ نا ہے، سیدھی ہی سے دیکھت ہے۔" اب اس کو یہ جستجو ہوئی کہ ہاتھی ادھر کہاں جا رہا تھا۔ اس نے تلاش کی تو صاحب بہادر کا جھولا درخت سے لگا دو نالا رائفل بھی مل گیا۔ پھر صاحب کے پیروں کے نشان ملے۔ وہیں پر مُنہ سے گرا ہوا سگار اور ہاتھ سے گری ہوئی برانڈی کی بوتل ملی، رائفل کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ دونوں نالوں میں کارتوس تھے۔ جھولے کا معائنہ کیا۔ اس میں شکاری چاقو، دو چار شیشیاں، سگریٹ کا بند ڈبّہ اور ایسی ہی بہت سی چیزیں تھیں۔ لیکن اس نے اُن کی کچھ فکر نہ کی۔ اُس نے کارتوس گنے اور مزید احتیاط کے لئے نئے کارتوس رائفل میں بھر کر دیکھے۔ اتنے عرصہ میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ کلوا اسی درخت سے پیٹھ لگا کر اس کی جڑ پر بیٹھ گیا اور پھر لڑکے کی موت کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ لگا تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا مشکل ہو گیا۔ درخت کے پتوں سے اوس ٹپکنے لگی اور دُور مالا ندی کے باہر جنگلوں میں سے چیتلوں کے کوکنے اور گوندوں کے ڈوکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

صبح پَو پھٹتے ہی کلوآ رائفل اور جھولا لے کر ہاتھی کے پیروں پیروں تیز رواںہ ہو گیا۔ اور شام تک برابر ایسے ہی چلتا رہا۔ دن میں دو ایک دفعہ گڑھوں اور نالوں کے قریب سے گزرا تو پانی پینے کو ضرور رُکا ورنہ ایک منٹ بھی کہیں نہ ٹھہرا۔ ہاتھی نے مالا ندی کے اس ٹاپو میں سے دوسرے کنارے کا رُخ کیا تھا۔ وہاں سے جنگل ہی جنگل شمال کی طرف چلا گیا تھا۔ شام ہوتے ہی کلوآ نے پھر نشانوں کو جھک کر دیکھا۔ گوبر کو چٹکی سے مَسلا اور مایوسی کی حالت میں سر ہلایا۔ ہاتھی اس سے پورے چوبیس گھنٹے پہلے کا چلا ہوا تھا۔ اب بھی یہ نشان کافی باسی تھے اور اب رات ہو رہی تھی۔ یعنی کلوآ کو اپنا تعاقب موقوف کر کے رات گزارنا تھی۔ اور رات ہی ہاتھی کو پھر کسی اور طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس طرح رات بھر میں پھر ان دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کا یقین تھا۔ لیکن کلوآ کر ہی کیا سکتا تھا۔ مجبوراً ایک درخت پر چڑھ کر رات بسر کی۔ دن بھر کا بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ ایک غنودگی کی حالت اُس پر طاری ہو گئی اور اسی طرح صبح ہو گئی۔ صبح یہ پھر روانہ ہوا۔ اب اس کو نہ جنگل کے ٹکڑوں کا دھیان رہا نہ سمت کا خیال رہا اور نہ اس کا بھی اندازہ رہا کہ کس قدر فاصلہ وہ چل چکا ہے۔ تھکن اور بھوک پیروں کو ڈگمگا رہے تھے اور تعاقب کا جنون سَر پر سوار تھا۔ انتقام کی آگ دل میں لگی تھی۔ ارادے کی قوت تھی جو آگے بڑھا رہی تھی۔

دن کے ایک بجے کے قریب اس نے جُھک کر ایک جگہ گوبر مَسلا۔ اندر سے نرم اور تَر تھا۔ کلوآ کو یقین ہو گیا ضرور صبح کا گوبر ہے۔ اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ہاتھی قریب ہی میں کہیں رُکا ہوا دن گذار رہا ہے۔ اس اُمید کے پیدا ہوتے ہی کلوآ اور تیزی سے روانہ ہوا۔ اب یہ کسی نالے کے گھنے کلک میں سے گذر رہا تھا۔ جہاں اکثر اسے اپنے چاروں ہاتھ پیروں پر ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ اس کلک میں کھیر کے چھوٹے چھوٹے کانٹے دار پودے مخلوط تھے۔ اب جو جو کلوآ آگے بڑھے کیچڑ اور دلدل زیادہ ہوتی جائے۔ ان سب

باتوں سے اُسے یقین ہو گیا کہ بس اس کے آگے ہی کہیں ہاتھی نے دن گذارا ہے اور شام ہوتے تک وہیں رہے گا۔ اب اس کے واسطے صرف یہی تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ اُس تک پہنچ جائے ورنہ شام ہو گئی تو ہاتھی رات میں کہیں اور نکل جائے گا۔ کلک کے ختم پر بیر کی جھاڑیاں شروع ہو گیئں۔ یہ اور بھی زیادہ گھنی اور کانٹوں دار تھیں۔ ان میں سے تو اُسے اوندھے لیٹ لیٹ کر آگے کھسکنے ضرورت پڑنے لگی۔ ایک جگہ ایسے ہی لیٹے لیٹے کھسک کر جھاڑی میں سے نکلا تو دیکھا کہ سامنے ہاتھی نے اپنا راستہ خود کاٹا ہے۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ راستہ کاٹنے کے نشان پر کچھ دور چلا کہ پھر گوبر ملا۔ اب جو اُسے چھوا تو بالکل تازہ گرم۔ اب اُس نے پیروں کے نشانوں کے بائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہاتھی بائیں آنکھ سے ہی کانا تھا۔ جو جو یہ آگے بڑھتا گیا پیروں کے نشانوں سے اور زیادہ ہٹ کر چلنے لگا۔ جنگل کے گھن کی وجہ سے بار بار اس کو پھر سیدھے ہاتھ کی طرف نشانوں کے قریب اُن کا رخ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت کلوا کی یہ حالت تھی کہ خفیف سے خفیف آواز پر اس کے کان لگے ہوئے تھے۔ نگاہیں دائیں بائیں ہر طرف یکساں چل رہی تھیں دونوں مٹھیوں میں دو دو زائد کارتوس اور بھرا ہوا رائفل سامنے اٹھائے چوکتا، جھاڑیوں کو کتراتا ڈھونڈھتا پھر رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک دفعہ پھر جب وہ پیروں کے نشانوں کی طرف آرہا تھا تو اُسے ڈالیوں کے چر چرانے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سے بیس قدم دور کھڑے ہوئے ہاتھی کے پاس آگیا۔ ہاتھی ترچھا کھڑا ایک درخت کی ڈالیاں توڑ رہا تھا۔ کلوا نے دو فیر تڑا تڑ اس کی کنپٹی پر کئے۔ جن سے کہ ہاتھی گھبرا کر بھاگ پڑا۔ اب کلوا نے شور مچاتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد اس شور کی وجہ سے ہاتھی کلوا کی طرف گھوم پڑا۔ کلوا ہاتھی کے سامنے ساکت کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی ہاتھی اس پر جھپٹا، یہ پھر اُس کے بائیں طرف پھُرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ اور نیزے بھر کے فاصلہ سے پے در پے

دو گولیاں پھر اُسی کنپٹی پر رسید کیں۔ جن سے کہ ہاتھی گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر دھماکے کے ساتھ زمین پر گر پڑا گرے ہوئے ہاتھی پر کلوا نے دو گولیاں اور جمائیاں اور اس کے ساتھ ہی خود بھی بندوق کا سہارا لیتے لیتے جھکتا چلا گیا۔ اور بیدم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے۔ لیکن انتقام کی آگ اب بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے پھر پڑے پڑے بندوق کو کھولا۔ خالی کارتوس نکالے اور جھولا گھسیٹا۔ وہ پھر کارتوس بھر کر اور فیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بندوق ہاتھوں سے گر گئی اور وہ بیہوش ہو گیا۔

لیکن دوسرے دن صبح دس بجے امیر احمد فارسٹ گارڈ مع دو چوکیداروں کے جب اس طرف آئے تو کلوا پاسی ہاتھی کے پیٹ پر بیٹھے ہوئے سر پکڑے رو رہے تھے۔ قانوناً اُن کو گرفتار کیا گیا۔ اور اسلحہ ناجائز کے استعمال کا مقدمہ ان پر چلایا گیا اور ساتھ ہی پانچسو روپے کے انعام کے مستحق ہونے کی بھی اطلاع دی گئی اور ان سب کارروائیوں کے سلسلے میں ایک دن میجر بوسٹ کو بھی برسرِ عدالت سر جھکا کر اپنے شکار کے تمام واقعات صحیح صحیح دوہرانا پڑے۔ اپنے بیان میں جہاں کہیں میجر بوسٹ اڑنے کو ہوتے تھے تو فوراً ڈپٹی کمشنر یعنی لیولس کا باپ اُن کو وہیں روک دیتا تھا۔ اور پھر کلوا پاسی سے اس کی تحقیقات کے مطابق سوال کرتا تھا۔ کیونکہ لیولس کی خوشی تھی کہ میجر بوسٹ سے خود اُن کی بزدلی کا اقرار کرایا جائے۔ جس کے سُننے کے واسطے وہ خود بھی عدالت میں موجود تھی۔

شیریں فرہاد

اگر میں یا آپ میں سے کوئی ہوتا تو ضرور رقت آمیز سُروں میں یہی مصرع بار بار دوہراتا۔ ع

سرِ بام آیئے ہم طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

لیکن اندھیری سُنسان گلی میں فرہاد تھوڑی دیر بعد دبی ہوئی آواز میں، عجب منت آمیز لہجے میں کھینچ کھینچ کے۔ "آؤ آؤ" ہی کہہ کے شیریں کو بلاتے رہے۔ اور شیریں کے سرِ بام نمودار ہونے میں جُوں جُوں دیر ہوتی گئی اُن کی "آؤ" میں درد کے سُر بڑھتے گئے یہاں تک کہ "آؤ" سے "عاؤ" ہوا اور عاؤ سے "عاعو" ہوگیا۔ جب جا کے کہیں شیریں صاحبہ چلکتی دِبکتی، ٹہلتی ٹہلتی کوٹھے پر آئیں۔ اور بڑے ناز و انداز سے سمٹ سمٹا کر چھجے پر بیٹھ کر نیچے گلی میں کھڑے ہوئے فرہاد کو دیکھنے لگیں۔

فرہاد نے آہِ سرد بھر کر کہا۔ "عا، عو۔"

شیریں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "میاں آؤ۔"

میاں تو عہد کر چکے تھے کہ گھر میں قدم نہ رکھیں گے۔ اُس دن ریکیٹ ایسا پڑا تھا کہ کمر میں آج تک درد تھا۔ اس لئے وہ اصرار کے ساتھ شیریں کو ہی گلی میں

بلاتے رہے۔ لیکن شیریں کو کیا غرض تھی کہ وہ جاتی۔ تھوڑی دیر بیٹھی اُن کی عاعو۔ عاعو سنتی رہی اور پھر ایک بار اور "میاں آؤ" کہتی ہوئی اٹھی اور آہستہ سے کوٹھے پر سے غائب ہوگئی۔

اب کہاں صبر ہو سکتا تھا۔ کیسا عہد اور کس کا ڈر۔ اُچک پڑوسی کی ڈیوڑھی پر اور وہاں سے پھلانگ چھت پر آ گئے۔ مگر سنگدل شیریں کوٹھے پر سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ مجبوراً اب یہ صحن کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ آہستہ سے چھجے پر آئے گردن بڑھا کر نیچے صحن میں دیکھا۔ کس قدر دلچسپ سین تھا۔ چاروں پیر جوڑ، دُم کو سمیٹ کر پیٹ سے ملا۔ دبک کر خاموش ہو گئے۔

صاف سُتھرے مختصر صحن کو بجلی کے دو قمقموں نے روشن کر رکھا تھا۔ اور تیسرا لیمپ مچھر دانیوں سے ڈھکی ہوئی پاس پاس بچھی دو مسہریوں کے سرہانے جل رہا تھا اسی کے برابر بجلی کا پنکھا (جس سے فرہاد کو سخت نفرت تھی) جھلل جھلل کرتا چمکتا گھوم رہا تھا۔ کچھ فاصلہ دے کر تختوں کا چوکا تھا۔ جس پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ چاندنی پر بسنتی زمین، گلابی پھول اور نیلے حاشیہ کا قالین بچھا تھا۔ اس پر گاؤ تکیہ، ایک طرف اُگالدان، دوسری طرف تانبے کا قلعی دار پٹاری نما پاندان اور ڈلی کی ٹوکری۔ تختوں کے برابر ایک چوکی پر سوندھے سوندھے دو نئے گھڑے ایک جھجری اور ایک صراحی دونوں کے گلوں میں موتیوں کے ہار لپٹے تھے۔ لوٹے، صابن دانی، بیسن دانی سب نئے جھلملاتے ہوئے۔

دوسری چوکی پر نعمت خانہ (جو کہ کھلا ہوا تھا) اس کے برابر میں چھوٹی سی انگیٹھی پر دودھ کی دیگچی جس پر موٹی بالائی آ چکی تھی۔

صحن کے دوسری طرف باورچی خانہ کی صحنچی کے پاس مُرغیوں کا ڈربہ تھا۔ باورچی خانے میں سے شامی کبابوں کے واسطے اُبلے ہوئے قیمہ کی بُو آ رہی تھی اور ڈربے میں سے رُک رُک کر مرغیوں کی کھُس پھُس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرہاد نے بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اس خاموش منظر کو دیکھا۔ آخر اُن کو یقین ہی ہو گیا کہ گھر میں انسان کوئی نہیں ہے اور اگر ان سفید سفید کپڑے کی کوٹھریوں میں کوئی ہے بھی

توضرور سو رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اب اور جرأت کی، اٹھے اور منڈیر منڈیر باورچی خانے کی طرف چلے۔ مچھر دانی کے اندر اقبال دلہن کے پاس لیٹی ہوئی شیریں نے اُن کو دیکھ لیا۔ پنجوں پنجوں مچھر دانی کھسکا، سٹ مسہری سے نیچے کود، لگیں ٹہلنے۔ کوٹھے پر سے فرہاد نے اُن کو جو دیکھا خورش کا خیال ترک کر جذباتِ عالیہ کی طرف رجوع ہوئے عجب سوز و گداز تھا۔ فرمایا۔ "عاعو"

اُن دو میں سے ایک سفید حجرہ ہلا۔ اور ساتھ ہی زور دار آواز آئی۔ "وہ دیکھو وہ دیکھو وہ آگئے آپ کے فرہاد۔"

دوسرے سفید حجرے میں سے مہین لوچیلی آواز آئی۔ یہ نہ کہیئے! یہ نہ کہیئے کہ آپ کے فرہاد، فرہاد ہوگا تو اس چڑیل شیریں کا، میرا کیوں ہونے لگا۔"

"تو تمہارا فرہاد کون ہے؟"

"میرا کوئی بھی نہیں... اور... اور... سوائے آپ..... اور....."

"کہو، کہو۔ چپ کیوں ہوگئیں؟"

"بھئی ہوگا۔ میں نے تو ابھی ابھی پیروں میں مہندی لگائی ہے۔ کچھ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ آپ ہی اٹھ کر نعمت خانہ بند کر دیں۔"

سفید حجرے میں حرکت ہوئی۔ لرزا، کانپا اور شق سا ہوا۔ فرہاد صحن کی طرف سے گلی کی طرف نکل گئے اور اقبال احمد صاحب الیکٹرک سپلائی کمپنی کے نوجوان، کلین شیو، شفٹ انجنیئر صاحب، سنہری عینک لگائے، ساقی کا سالنامہ ہاتھ میں لئے، سیاہ دھاریوں کا نائٹ سوٹ پہنے نمودار ہوئے۔ نعمت خانے کے پاس گئے، تو اُن کی تین ماہ کی بیاہی ہوئی بیگم یا دولہن نے لوچ، منت، غرور، محبت اور شرم پانچوں حربوں کو ادا کرنے والے ایک عجیب لہجے میں کہا۔ "کبابوں کے واسطے اُبلا ہوا قیمہ بھی تو ہے۔ آپ جیتے رہیں، بھئی ذرا اور بڑھ جایئے اس کی پتیلی بھی اٹھا لایئے۔ اور یہ دودھ بھی سب نعمت خانہ میں رکھ دیں۔"

اقبال احمد بغیر ایک لفظ بولے آہستہ سے باورچی خانہ کی طرف مڑے، اندر گئے

جسم سے دُور چٹکی میں لٹکائے ہوئے دھوئیں سے کالی پتیلی لائے، اس کو اندر رکھا پھر دُودھ کی پتیلی رکھی۔ نعمت خانہ بند کیا۔ اب چلے ہی تھے کہ پھر آواز آئی۔

"رحیمن سرِ شام ہی گھر چلی جاتی ہیں۔ کتنا ہی کہو کہ اے بُوا ذرا رک جاؤ، مگر وہ کب سُنتی ہیں۔ نہ معلوم دڑبہ بند کیا کہ نہیں۔ بھئی اس کو بھی دیکھ لیجئے۔"

اقبال احمد نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مسہری سے دڑبہ کا رُخ کیا۔

"آخر یہ شوق بس شوق یہ بلّی پالنے کا کیسا شوق ہے؟ یہی حرامزادی تمہاری شیریں شہر بھر کے بلّے بلا کر لائے گی۔ ابھی تو ایک ہی فرہاد آئے ہیں۔ دیکھو تو درجنوں آئیں گے۔"

شیریں اپنی جنس کی فطرت کے مطابق محلّہ کے حلوائی کے کبڑے بلّے کو اپنی دو چار ادائیں دکھا کر پھر اقبال دولہن کے پاس گھس آئی تھیں۔ دولہن نے اپنا حنائی ہاتھ بلّی کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیوں ری شیریں! تیرا ایسا ہوائی دبدبہ ہوا ہے۔"

شیریں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور خرخر کرتے ہوئے سر کو اور بھڑا کر دولہن کے ہاتھ سے رگڑتی ہوئی چلیں تو دُم کی نوک تک چلی آئیں۔

لیکن اقبال احمد مرغیوں کے دڑبے سے واپس لوٹے تو اپنی مسہری پر نہ آئے بلکہ دالان کی طرف بڑھے تو فوراً نسیمہ (دولہن) نے چونک کر کہا۔ "اب کہاں چلے۔ اے کہاں جارہے ہیں بولئے تو۔"

"فرہاد کی دعوت کا سامان کرنے۔"

"بھئی خدا کے لئے نہیں۔ آپ کو ہماری جان کی قسم کچھ نہ کہیئے گا۔ بلّی کو نہیں مارنا چاہیئے۔ سُنا نہیں، بلّی کو مارو تو روئی کے گالے سے مارو۔ واہ آپ تو خوب ہیں۔ اُس روز موئے کے تھاپی اس زور سے ماری۔ مجھے وہم آتا ہے۔ بھئی کیا کر رہے ہیں۔ آخر ارادہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں دعوت کرنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی بلائی کھلاؤں گا فرہاد

صاحب کو۔"

یہ کہتے ہوئے اقبال احمد کمرے میں غائب ہو گئے اور وہاں سے چھوٹی میز ایک مُراد آبادی بڑی سی تھالی اور بجلی کے تار کی ایک لچھی لئے ہوئے آئے۔ میز پر تھالی رکھی۔ تھالی کے بیچوں بیچ میں طشتری میں تھوڑی سی بالائی اور دودھ رکھا۔ پھر بجلی کا ایک تار ننگا کر کے تھالی کے نیچے دبا دیا اور دوسرا چینی کی طشتری میں دُودھ میں ڈال دیا، اور جب یہ سب ہو گیا تو پلگ لگا دیا۔

"اوئی اللہ، اس وقت تو شیریں تم وبالِ جان ہو گئیں۔ ایکساں چائیں، مائیں، چائیں مائیں گھسی چلی آ رہی ہیں۔ اے رحیمن، اے رحیمن بُوا، تم تو کوٹھری میں جاتی ہو تو بیٹھ ہی جاتی ہو۔ اے چلو آؤ۔ لاؤ گھی، بس دو ہی ٹکڑوں بھر کا اور چاہیئے ہے۔ لاؤ جلے جاتے ہیں۔ عید و میرا بھیا جلدی سے دُھولا۔"

کٹکٹاتے جاڑے، شام کا وقت، منٹوں میں تو رات ہوتی ہے۔ میاں نے پانچ بجے کا وقت پارٹی کا بتایا تھا۔ نسیمہ نے جلدی جلدی سب طرح کا پکوان، شاخیں، سوہال، کھجوریں، نمک پارے، خستہ کچوریاں، آلو، قیمہ، پوریاں، تلے انڈے سب تیار کر لئے تھے۔ نان پاؤ کے ٹکڑے تل رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہتی تھی۔ آج ضرور میاں ان سب کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔

"آئی میاں" کہتی ہوئی رحیمن دوڑی۔ نسیمہ نے دوپٹے کے آنچل سے چولھے میں سے اڑی ہوئی منہ پر کی راکھ پونچھی۔ مسٹر اقبال احمد چوخانے دار اونی ہوز، خاکی نیکر، نیلا بلیزر پہنے گلے میں چھ انچ لمبی، تین انچ چوڑی بو لگائے، سر پر بانکا فاختی مرغی کے پر سے آراستہ فیلٹ کیپ اوڑھے گھر میں داخل ہوئے۔ ہاتھ کا پلندہ تخت پر رکھا۔ ڈورے نوچے، کاغذ پھاڑا۔ اس میں سے چار ڈبے نکلے۔ مکھن کا ڈبہ، رس بھری جام کا ڈبہ، پنیر کا ڈبہ اور ۵۵۵ سگریٹ کا ڈبہ، جیب سے چاقو نکال انہی کے کھولنے میں مشغول ہو گئے۔ اور جب سب سے ضدی مکھن کا ڈبہ بھی بہزار خرابی کھل گیا تو

بیوی کو آواز دی۔

"کیوں بھئی اب نکلو گی بھی کہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک تمہارے پکوان میں سے کچھ بھی تیار نہیں ہوا۔ میں تو سمجھتا ہی تھا۔"

"جی نہیں، سب ہو گیا۔ سب تیار ہے۔ اے لیجئے میں ابھی آئی۔" یہ کہتی ہوئی نسیمہ باورچی خانے سے ایک پیر کی پھٹی ہوئی چپل گھسیٹتی ہوئی نکلی۔

"آخر نئی چپل کس دن کے واسطے اٹھا رکھی ہے؟ خیر ہوگا، تم سے تو کہنا فضول ہے۔ لاؤ ڈبل روٹی لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ سینڈوچز بناؤں۔ دنیا کی بیویاں یہ کام کیا کرتی ہیں۔ یہاں ہم خود کرتے ہیں۔ بیوی ہماری کچھ جانتی ہی نہیں۔ کیا بتاؤں، امین آباد میں ان چیزوں کے لینے میں دیر ہو گئی۔ اے بھئی لاؤ۔ کھڑی کیا سن رہی ہو۔ لاؤ ڈبل روٹی، انڈے اور انگیٹھی بھی۔"

نسیمہ کی صورت افسردگی، گھبراہٹ، پریشانی، خوف، مری ہوئی آواز میں پوچھا "نان پاؤ۔ نان پاؤ؟"

"ہاں ہاں نان پاؤ۔ ارے ڈبل روٹی کہونا۔ ہائے افسوس۔ مر گئے نان پاؤ کے کھانے والے اور مر گئے نان پاؤ کے پکانے والے۔ لیکن ہماری بیوی آج بھی نان پاؤ ہی کہتی ہیں۔ ریکیٹ منھ سے نہ نکلا۔ جب کہا تھا پی۔ اچھا ڈبل روٹی نہ سہی۔ نان پاؤ سہی، وہ ہے کہاں؟"

"مجھ سے بھول ہو گئی۔"

"اچھا کوئی نیا شگوفہ کھلا ہے۔ ہاں بھئی کیا بھول ہو گئی؟"

"میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔"

"ارے کچھ کھل کر کہو تو سہی۔"

"اب آپ جو جی چاہے کہیئے۔ بیشک مجھ سے قصور ہو گیا۔ کل آپ نے کچھ کہا تو تھا میں نہ معلوم کیا سمجھی۔ میں نے تو نان پا.... ڈبل روٹی کے میٹھے ٹکڑے پکا دیئے۔"

اقبال احمد کے ہاتھ کی کہنی تخت پر ٹک گئی۔ سر ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹک گیا۔ مری

ہوئی آواز میں۔ "اچھا وہ انڈے!"

نسیمہ کی جان میں جان آئی۔ کچھ کھلی آواز میں اطمینان کے لہجے میں بولی۔ "وہ تو تیار ہیں۔ سب تلے رکھے ہیں۔"

"ہائیں! افسوس، افسوس! آملیٹ بھی ختم۔ ہائے ری قسمت۔"

نسیمہ کے منہ پر اب ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ خاموش سُنتی رہی۔ ارے میں تو سمجھتا ہی تھا کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ پارٹی کیا ہوگی اور سبکی ہوگی۔ کیا کرتا سب سر ہو گئے۔ ترقی ہوئی ہے پارٹی دو۔ پارٹی دو۔ اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے ہو۔ اس روز رابرٹسن نے پارٹی کی کیسی ..... خیر اس کو جانے دو۔ مقبول نے پارٹی دی۔ کس قدر اس کی بیوی سلیقہ مند ہے۔ کیک بھی گھر کے ہی بنے ہوئے تھے۔ اچھا جو میں کل کیک لایا تھا وہ تو ہیں یا انہیں بھی کچھ کر ڈالا؟"

نسیمہ نے کیک لا کے دیئے۔ عیدو کو آہستہ سے بلایا۔ اپنا پکایا ہوا سامان پلیٹوں میں لگا لگا کر رکھا۔ اقبال احمد نے عیدو کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے کمرے میں میز پر سب سامان لگایا اور ہر ہر طرح عیدو کو سب سمجھا دیا کہ یوں چائے لانا۔ یہاں کھڑے رہنا۔ اس طرح سے برتن رکھنا اور اٹھانا۔ غرضیکہ نیا چھوکرا اور ہندوستانی ناشتہ قہر درویش بر جانِ درویش۔ سب تیاری کر چکے تھے۔ ہنستے ٹھٹے لگاتے چاروں دوست جن کو مدعو کیا تھا سائیکلوں پر آ گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ پارٹی ہر طرح سے کامیاب رہی۔ رابرٹسن نے دہی بڑے بہت بہت ہی مزے لے لے کر کھائے۔ اور کہا کہ ہماری میم صاحب کو بھی ایسا پکانا آجائے تو اچھا ہے۔ آپ کی بیگم سکھا دیں گی؟"

مقبول نے تو صاف کہہ دیا۔ "یار یہ اچھا کیا یہ چیزیں تیار کروائیں۔ واللہ لطف ہی آگیا۔

کیک کسی نے چھوئے بھی نہیں۔ اقبال احمد بہت خوش تھے۔ خیر۔ بگڑی بات بن گئی۔ نیا چھوکرا عیدو بالکل جنگلی۔ لیکن خیر وہ بھی خاموش رہا۔ کوئی خاص بدتہذیبی

نہ کی۔ ایک دو دفعہ ان لوگوں کی ہنسیوں میں خواہ مخواہ خود بھی شامل ہونے کی شروعات ضرور کی لیکن اقبال نے جونہی گھورا فوراً دانت بند کر لئے۔

ناشتہ بڑے قرینے اور سلیقے سے ختم ہوا۔ اور عین اس وقت جبکہ یہ لوگ میز پر سے اٹھنے ہی کو تھے، آسمان پر سے ایک بلائے ناگہانی پھنکاریاں بھرتی اور گزوں اچھلتی ٹپکتی کہ اللہ کی پناہ! میز الٹی۔ برتن ٹوٹے، مہمان بھاگے۔ آپس میں ٹکرائے، کرسیوں میں الجھے اور گرے۔

عیدو صاحب نے تین ہی بجے سے موقع بہ موقع تھوڑی تھوڑی چیزیں چرا کر تانبے کی بیسن دانی میں جمع کی تھیں۔ تاکہ رات کو فرصت میں اُن کا مزا لیا جائے۔ بیسن دانی روشندان کے پاس ہی چپتے سے ڈھکی رکھی تھی۔ مقدر کے کھوٹے فرہاد صاحب شیریں کے فراق میں پھرتے پھرتے اُس کے پاس آ گئے۔ ناک میں بُو کیسے نہ جاتی اور ترمال کی بُو آ رہی ہو۔ تو کیسے چھوڑ دیں۔ لیکن بیسن دانی کا منہ تنگ تھا۔ سر اندر تو چلا گیا مگر باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ اندھے بھینسا بن گئے۔ آگے پیچھے ہٹتے ہٹتے روشندان میں سے ٹپک پڑے اب جو گرے اور اتنے بہت سے اجنبی آدمیوں کی ایسی ایسی آوازیں سنیں تو پھر کیا تھا چاروں پنجوں کے ناخن نکالے، پھنکاریاں بھرتے زمین سے آسمان کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ اور آسمان سے زمین پر گرتے تھے۔ ظالم دو دو گز اچھل رہا تھا۔

"۴"

ہر طرف تاریکی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا دھواں محلہ کی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ افقِ مغرب پر سورج ڈوب رہا تھا اس کی یادگار گہرے سیاہی مائل بادل کے دو چار ٹکڑے شرمندہ وجود تھے۔ لیکن ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سی دور بہت دُور بازار کی طرف سنائی دے رہی تھی۔ پاس ہی کے ایک مکان سے کسی شیر خوار بچے کی ایک سانس اور ایک سُر میں رونے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ اطراف کی گہرائیوں اور کوٹھے کی دیواروں کی جڑوں میں سیاہی قدم جما چکی تھی۔ شیریں کوٹھے کی چونا لگی دیوار پر ساکت اپنے سامنے کی منڈیر پر نگاہیں جمائے افسردہ بیٹھی کسی گہری سوچ میں غلطاں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سوچ بس افسردگی ہی تک محدود تھا۔ واقعات

کی باد، اُن کا تسلسل حادثات کی وجہ اور اُن سے نتیجہ نکالنا یہ سب باتیں وہ بیچاری کہاں جانتی تھی۔ جب بھی وہ اپنی سہیلی نسیمہ کو رنج اور تکلیف میں دیکھتی تھی تو اس پر بھی رنج کا جاں گسل غلبہ چھاجاتا تھا۔ نسیمہ کیوں اور کس لئے جسمانی تکلیف اور روحانی کوفت میں مبتلا ہے۔ اس سے اس کو کیا سروکار، اس کو گذشتہ کے بھی وہ دونوں واقعات یاد نہ تھے۔ جب پہلے دو دفعہ نسیمہ کے یہاں ستوانسے بچے پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ اب تیسری باری تھی۔ وہی ستوانسہ بچہ پیدا ہوا۔ اور نہ صرف خود ہی پیدا ہوتے مرگیا بلکہ ماں کو بھی بلاوا دیتا گیا۔

پہلوٹھی کی دفعہ زچہ خانہ میکے میں ہوا تھا۔ ماں کے علاوہ خالہ، ممانی اور بھابی سب ہی تیمار دار تھے۔ دوسرے کی دفعہ میکے نہ جاسکی۔ لیکن ماں زندہ تھی۔ گو قسم کھالی تھی کہ داماد کے گھر قدم نہ رکھیں گی۔ لیکن وقت پر پیٹ پکڑے دوڑی چلی آئیں۔ اب کی کون کرتا۔ ماں چل بسیں، خالہ نے انکار کر دیا۔ بھاوج خود پورے دنوں سے، سسرال والے نئے بکھیرو، نام و نمود کے دیوانے گز بھر اونچے ہوئے تو اترا گئے نیچے کی دنیا آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

اقبال احمد اسی گوشت پوست کے بنے، ٹھیک اسی ڈھرے پر چل رہے کہ جیسے ایک ہی سیڑھی اوپر چڑھتے تھے نیچے کی سیڑھی کھود ڈالتے تھے۔ شفٹ انجنیئر سے اسسٹنٹ انجنیئر ہوئے۔ پرانے دوستوں کو طلاق دی، نئے بڑھیا دوست پیدا کئے۔ اسسٹنٹ سے ریذیڈنٹ انجنیئر ہوئے تو ان سے بھی بے تکلفی چھوڑی۔ عہدے سے زیادہ اخلاق برتا، سادگی چھوڑی، کمال ہمدردی اور محبت جتائی، کس خوبصورتی سے اُن کو بھی دھتا بتائی اب جو جورو کی طبیعت خراب ہوئی تو کون آیا، مسز جھا، مسز رحمٰن، مس فرحت وغیرہ۔ ایسی پرندیاں لپ اسٹک لگائے، کیمرے، ناولیں، چھتریاں ہاتھوں میں لئے فاشسٹ اور سوشلسٹ مسائل پر گفتگو کرتی، لپ جھپ کرتی، قہقہے لگاتی آئیں۔ چائے پی، چاکولیٹ کھائے، سگریٹ پئے۔ بیس منٹ، آدھ گھنٹہ ٹھہریں، ہمدردی جتائی۔ نصیحتیں کیں، معالج بنیں اور چل دیں چلتے چلتے پھر ہمدردانہ نصیحتیں کرتی گئیں۔

"مسز اقبال آپ کو چاہیئے کہ ضرور آپ ایک نرس کو ہفتے دو ہفتے کے واسطے کرایہ پر رکھ لیں۔ یہ دائی لوگ کیا جانیں مریض کو رکھنا اور مریضہ کو بالکل اٹھنے بیٹھنے نہ دیں، آرام کریں، بالکل آرام، شور و غل کچھ نہیں۔ آپ بھی ان کے کمرے میں بہت کم جائیں بلکہ بالکل نہ جائیں۔ خاموشی، آرام، بس..... اور.... مکان.... بھی ٹھیک نہیں۔ کیوں نہیں آپ شہر سے باہر کوئی چھوٹا سا مکان لے لیتے۔ بڑے سستے مکان مل جائیں گے۔"

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے شوہر کی نام لیوا مسز ہل سند یافتہ نرس، مبلغ چار روپیہ یومیہ پر نسیمہ کی تیمارداری کے لئے دوسرے ہی دن تعنیات ہو گئیں اور اس باکمال سحر نواز معالجہ نے اپنی انتھک کوشش اور توجہ سے بہت جلد لبِ گور نسیمہ کو قطعی موت کے ہاتھوں سے کھینچ کر طویل عرصہ کے لئے مُردہ زندگی بسر کرنے کو چھوڑ دیا۔

اس کو نہ معلوم کب اور کس وقت ہوش آیا کچھ اندھیرا سا تھا۔ افسردہ دل لرزاں تھا، ہاتھوں میں کپکپی تھی۔ سر میں چکر تھا۔ اماں وہیں تھیں کہ نہیں۔ یاد پر قابو نہ تھا، آنکھیں کھولیں، کسی کو پھرتے دیکھا۔ کون ہے؟ یہ کون ہے؟۔ مسز ہل گھوئیں بیگم کو ہوش میں پایا۔" اوکھدا، اوکھدا۔ تیرا شکر۔ بیگم اب اچھا ہے۔ فکر نہ کرے۔ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

نسیمہ نے ایک جنبش اور محسوس کی۔ آنکھیں اور کھولیں۔ بینائی نے ترقی کی، ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ دماغ ٹھیرا، یاد اور حافظہ نے ہلہ بولا۔ عقل کی دستگیری کی، مکان .... گھر.... عورت..... میم بلکہ ڈاکٹرنی ..... اس کے بازو ہیں ..... مرد..... اپنا مرد.... وہ ..... وہ ..... وہ .... اللہ شکر، تیرا شکر.... وہ، وہ کیا کر رہے ہیں.... ڈاکٹرنی کو تک رہے ہیں اور اس طرح تک رہے ہیں۔ ڈاکٹرنی حسین ہے، وہ ہاں۔ انہی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ اِدھر اب بھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز۔ "مسز ہل انگریزی، انگریزی.....۔"

میم کی آواز۔ " انگریزی انگریزی.... مسز اقبال..... انگریزی.... انگریزی۔"

"آنکھیں بند کر کے سنوں۔"

آنکھیں بند کر لیں اور آوازیں مدھم اور۔ "ڈولی آئی ہے۔ ڈولی آئی ہے" کی آوازیں تیز ہونے لگیں۔ ہر طرف سے ڈولی آئی ہے، ڈولی اُترو الو کی آوازیں تیز ہوئیں۔ اور پچاسوں ڈولیاں نسیمہ کے چاروں طرف ناچنے لگیں۔

اندھیری دیوار پر آہستہ سے فرہاد کا سر نمودار ہوا۔ پھر سینہ، پھر پیر بھی اوپر آئے۔ اور اب فرہاد دیوار دیوار شیریں کی طرف بڑھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ انتہائے فلک پر سُرخی کا ایک دھبہ باقی تھا۔ بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ دُور کہیں ایک ڈھولک بھی بجنا شروع ہو گئی تھی۔ دو ایک گھریلو چمگادڑ ہوا میں سپاٹے بھر رہے تھے۔ فرہاد "آؤ، آؤ" کرتے شیریں کے قریب آئے۔ لیکن وجہ در وجہ اسباب، جانے شیریں کے حیوانی دیدوں میں دو آنسو کیوں تھے؟ وہ دیوار سے کوٹھے پر کودی اور وہاں سے نیچے تیزی سے غائب ہو گئی۔

صدقے، صدقے شیریں، تیری متبرک آنکھوں کے صدقے۔ دنیا بھر کے سچے موتی تیرے ان دو آنسوؤں پر نثار۔

اور چونکہ اس زمانے میں شیریں اکثر افسردہ اور غمگین رہتی تھی اس لئے فرہاد کے دل پر بھی بڑا اثر تھا۔ وہ بیچارہ اپنی سی ہر کوشش شیریں کا غم غلط کرنے کے لئے کرتا رہتا تھا۔ گلیوں کے چوہے، دیواروں پر گلہریاں یا کسی دُور دراز مکانوں سے چھپٹا ہوا طوطا منہ میں دبائے ہوئے شیریں کے پاس آتا تھا اور اس طرح سے شیریں کو ان اَدھ مرے جانوروں سے کھیل کود میں مشغول کر لینے میں کبھی کبھی کامیاب ہو جاتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر کے مشغلہ کے بعد پھر شیریں کچھ بیزار سی معلوم ہونے لگتی تھی۔ فرہاد کو اپنی ان ناکام کوششوں کو جاری رکھنے کے واسطے بھی بڑی مشکلوں کے سامنے کرنے پڑتے تھے۔ اب وہ قریب قریب روزانہ اقبال احمد کی زد میں آجایا کرتا تھا۔ لیکن معمولی جوتے، رُول، پیپر ویٹ وغیرہ سے وہ کچھ زیادہ خائف نہ تھا۔ اس کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ جس طرح سے

بھی ہو وہ شیریں کا غم غلط کرے۔ لیکن اکثر شیریں اس کو نہ ملتی تھی۔ اور وہ اُس کی تلاش میں کمروں میں بھی گھس جاتا تھا۔ اور چونکہ فطرت سے مجبور تھا اس لئے اس دن جب اس نے کھلے ہوئے نعمت خانے میں سے پنیر کی بُو سونگھی تو شیریں کی تلاش ملتوی کر دی۔ نعمت خانہ کی طرف بڑھا۔ لیکن جیسے ہی وہ اندر گھسا دھڑ سے نعمت خانہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فرہاد بڑے زور سے اُچھلا۔ اس کا سر ڈھکنے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی ہاتھ میں سُتلی لئے اقبال احمد دوڑتے ہوئے نعمت خانے کے پاس آئے۔ فرہاد نے پھنکاریاں بھرتے ہوئے پیٹھ پر کے بال کھڑے کر کے پنجوں کے ناخن نکال نعمت خانہ کی جالی کو کھکوڑ مارا۔ ممکن تھا کہ وہ سخت جالی کو نوچ کر باہر نکل بھاگتا لیکن مہلت ہی نہ ملی۔ پہلے تو چاروں طرف سے بید پڑنے لگے۔ پھر فرشی دری دوہری کر کے نعمت خانہ پر ڈال دی گئی۔ اب جو دروازہ کھلا اور وہ اس میں سے جھپٹا تو دری میں اُلجھا۔ خدا کی پناہ کس مصیبت کا سامنا تھا۔ اوپر سے دبایا گیا چاروں طرف سے دری کو تہوں میں لپیٹا گیا۔ اس لپیٹنے کی حالت میں سانس گھٹتی تھی۔ ہاتھ پیروں کی ہڈیاں چاروں طرف کے دباؤ سے ٹوٹی جاتی تھیں۔ پنجے چلاتا تو کس طرح سے۔ اُلٹ اُلٹ کر ہر پہلو سے رکھا گیا۔ پھر اس کی دُم دری سے باہر کھینچ لی گئی۔ جس پر کہ ایک سُتلی اس زور سے کھینچ کر باندھی گئی کہ تکلیف سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کش مکش کی حالت میں بڑی دیر تک وہ مبتلا رہا۔ خدا خدا کر کے اس دری میں سے جب اس کی رہائی ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو ایک ٹین کے چھوٹے سے تنگ و تاریک ڈبّے میں مقیّد پایا۔ اس کی دُم کے وسط میں اب بھی ایسی تکلیف تھی کہ اُس کو معلوم ہوتا تھا کہ دُم وہاں سے کٹ کر جا گرے گی۔ وہ بیچارہ سر گھما کر اپنی دُم تک منہ میں نہ لے جا سکتا تھا کیونکہ گھومنا مشکل تھا۔ اس تنگ و تاریک قید خانہ میں نہ ہوا کا گزر تھا اور نہ روشنی کا۔ عمر بھر میں پہلی مرتبہ اندھیرے سے سابقہ پڑا تھا۔ پنجے چلاتا بھی تو وہ بھی کارگر نہ ہوتے۔ ناخن ٹین پر کھچ کھچاتے ہوئے پھسلتے تھے۔

اس نے تکلیف اور غصہ میں " نہ عاؤں، نہ عاؤں " کہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی حالت میں گھنٹوں گذر گیے۔ اسے نہ معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی اس کا فولادی قیدخانہ ہلتا تھا۔ کبھی پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ کبھی ہلتا تھا تو ہلتا ہی رہتا تھا۔ یہاں اس کی یہ حالت تھی کہ دم گھٹتے گھٹتے بیچارہ عجب نیم بے ہوشی کی حالت میں تن بہ تقدیر پڑا تھا۔ آواز بھی کمزوری سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی حالت میں اسے کچھ تازہ ہوا معلوم ہوئی۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ جان میں جان آئی۔ پھر اسے کچھ روشنی معلوم ہوئی اور تازہ ہوا بھی اور آئی۔ کوئی اس کا ڈبہ کھول رہا تھا۔ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ یہ اب بھی پیش آنے والی ہر مہم کے واسطے تیار ہو گیا۔ ٹھک، ڈھکنا کھلا۔ جھک سے اُجالا ہوا فش فش فرہاد پھنکارے۔ اور بڑی زور سے اُچھلے۔ مسز ہل۔ " او مائی جیزیز کرائسٹ " کی کوک بھرتی ہوئی صوفے پر پیچھے جھکیں۔ اور فرہاد صاحب چاروں پنجوں کے بیس ناخن ہوا میں چلاتے ہوئے اُن کی گود میں اترے۔ مگر چونکہ دونوں میں ایک دوسرے سے کچھ بھی دلبستگی کا واسطہ نہ تھا۔ اس لئے جس آناً فاناً میں یہ وصل ہوا تھا اس سے بھی جلد دونوں میں فصل ہو گیا۔ میم صاحب غلسخانہ کی طرف اور فرہاد صاحب برآمدہ کی طرف بھاگے۔ ان کو تو غسل خانہ کا دروازہ بند کر کے امن حاصل ہو گیا۔ لیکن فرہاد بیچارے کی دُم کے پیچھے جھن جھناتی چھن چھناتی ایک ایسی بلا دوڑ رہی تھی کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔ جو جو یہ جان توڑ کر بھاگتا وہ جھن جھناتی مصیبت اس کا پیچھا کرتی تھی۔

بھاگتے بھاگتے بیدم فرہاد حضرت گنج کے چوراہے پر پہنچے۔ وہاں پورے دلو درجن سیاہ سفید چتکبرے بابا لوگ مختلف قسم کے شیطانی مشاغل میں مصروف ہوا خوری کر رہے تھے جنہوں نے چاروں طرف سے فرہاد پر یورش کی کسی کی کک پڑی، کسی کی ہاکی اسٹک اور ایک ڈھائی فٹ کا چقندری تو ایسا ہٹلر نکلا کہ اس کا لنگڑ پیخ فرہاد کی دُم پر پڑا۔ اور پڑتے ہی پیخ پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے

اینچا تانی فرہاد کی طرف سے ہوئی کہ فرہاد کو چار و ناچار اپنی آدھی دُم وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خیر دُم گئی تو غم نہیں جان تو بچا لایا۔ اور دُم کے ساتھ جھنجھنوں سے تو پیچھا چھوٹا جو کہ تانبے کے تار سے اس کی دُم سے بندھے ہوئے اس کی دُم کے ساتھ بھوت کی طرح لگے ہوئے ڈرا ڈرا کر دَم ہی نکالے دیتے تھے۔ اب دُم اور دُم کے جنجال سے سبکدوش ہو کر ہلکا پھلکا بھاگا تو اس نے سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ راستے، گلی، کوچے اور محلوں کے جاننے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر کی سمت تک کے دریافت کرنے کی اس کو حاجت نہ تھی۔ قدرت نے بلیّوں کو ایک خاص حس ایسی دی ہے چاہے جہاں اور جتنی دُور اُن کو بند کر کے لے جاؤ اور چھوڑ دو، جب چلیں گی تو سیدھی گھر کی طرف۔ دُم شکستہ فرہاد بھی چھتیں، دیواریں، مہریاں گلیاں پار کرتے، کتّوں سے بچتے، مرغیوں، کبوتروں اور چوہوں کے دل دہلاتے پٹتے پٹاتے اور راستے بھر بقیہ دُم کے فاؤنٹین پن سے سُرخ روشنائی کی بوندیں ٹپکاتے آخر گھر آ ہی گئے۔

لیکن زمانہ ایک حالت پر نہیں ٹھیرتا۔ فرہاد اور شیریں کی زندگی نے اب ایک نیا دور اختیار کر لیا تھا۔ محبت کی پُر مسرت جستجوئیں اور ناکامیاں، مہمیں اور پریشانیاں مع اپنی پُر سحر دلچسپیوں کے ختم ہو چکی تھیں۔ اب ایک پھیکی اور سیدھی سادی زندگی یہ دونوں نسیمہ کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ فرہاد حلوائی کی دوکان سے بالکل بے واسطہ ہو کر یہاں ہی دن رات رہتا تھا۔ اب اس گھر میں اس کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اقبال احمد نے یہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی مس زہل کو مسز اقبال بنا کر حضرت گنج میں رہنے لگے تھے۔

وہ غزالِ پا شکستہ سے سوا مظلوم نسیمہ بے زبان یاس کی پتلی، شیریں اور شیریں فرہاد ہی کیا، گھر بار، کپڑا پیسہ بلکہ خود اپنی جان سے لاپروا ایک مسلسل اچنبھے اور بیہوشی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ گو اقبال اب بھی اس کو پچاس

روپئے مہینہ خرچ کے لئے دیتے تھے۔ لیکن اس کو روپے کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس روپے سے دلچسپی رکھنے والے افراد یعنی رحیمن اور عیدو نے باورچی خانے اور کوٹھریوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی ماندہ گھر پر بظاہر قبضہ شیریں اور فرہاد کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دونوں کمرے کوٹھریوں اور برآمدہ کے کونہ کونہ میں پڑے پھرتے تھے۔ گھر میں ہر طرف گرد اور کوڑا، پھٹے ہوئے کاغذ اور کپڑوں کے چیتھڑے پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ صحن میں جابجا گھاس اُگ کر اس پر کپڑوں میں چمٹنے والی بالیاں اُگ آئی تھیں۔ مُرغیوں کے دڑبے کے اوپر اور چاروں طرف چیڑ پٹے کے چھتے اُگے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی کے پاس ایک اونچا اگالدان اتنے عرصہ سے اوندھا پڑا تھا کہ اب وہ قریب قریب آدھا چولائی میں چھپ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے کونے میں عیدو کے کھائے ہوئے آموں کے درخت اُگ آئے تھے۔ خود نسیمہ کی چارپائی کو برآمدہ کے ایک کونے میں پڑے پڑے اتنا عرصہ گذر گیا تھا کہ چارپائی کے نیچے فرش پر چوکور نشان الگ نظر آتا تھا۔

نسیمہ کا سارا وقت بیٹھے چھالیا کترتے یا "راہِ نجات" اور "حلیمہ دائی" کی کتابوں میں سے کسی کو پڑھنے میں گذرتا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف یہ دو کتابیں تھیں بلکہ کسی اور کتاب کے پڑھنے کی اِس میں قابلیت بھی نہ تھی۔ یہ دونوں کتابیں اسے حفظ سی ہوگئی تھیں اور انہی کو بار بار پڑھتی تھی۔

حلیمہ دائی کی مختصر اور سادہ نظم کے ہر ہر شعر میں اُس کو عجیب وغریب پُر اسرار کشف اور دردِ پنہاں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مقدس کتاب (جس کے اشعار کے لفظ بہ لفظ معنی بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی) ایک آنے والی پُرسکون اور اصلی زندگی کے مژدوں سے پُر تھی۔ وہ اس کو معصوم جذبے اور ایسے سچے اعتقاد کے ساتھ پڑھا کرتی تھی کہ آنسوؤں کی قطار اس وقت تک نہ ٹوٹتی تھی جب تک کہ کتاب اس کے سامنے رہتی تھی اور چونکہ بیوی کے آنسو بہتے تھے اس لئے رحیمن کا فرض تھا کہ خود بھی ٹپہ ٹوئیاں آنسوؤں سے ساتھ دیں۔ یا کم از کم سڑا سڑ ناک ہی سونت سونت کر پلنگ

کے پائے سے پونچھتی رہیں۔

ایک روز سہ پہر کے وقت نسیمہ حلیمہ دائی کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ حسبِ دستور رحیمن پلنگ کی پٹی پکڑے زمین پر اکڑوں بیٹھی سُن رہی تھی۔ نسیمہ دو پیسے والی کتاب کے پارہ پارہ اوراق کو دونوں ہاتھوں سے تکیہ پر دبائے ہِل ہِل کر ایک سادے درد انگیز میلاد کے راگ میں ایک ایک شعر کو دو دو اور تین تین بار ادا کر رہی تھی اور دوپٹہ سے آنسو پونچھتی جاتی تھی کہ یکایک عیدو اپنی ڈور کنکیا چھوڑ تھپڑ تھپڑ بھاگتا ہوا کوٹھے سے دوڑتا آیا اور ہانپتا ہوا پاس آکر بولا۔ "بیگم صاحب کوئی آیا ہے۔"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ نسیمہ نے منہ اونچا کر کے پوچھا۔ "کون ہے۔ کہتا کیوں نہیں۔"

"بیوی! کیا معلوم کون ہے؟"

"اے رحیمن! دیکھو جاکر۔ پوچھو کون ہے؟"

ڈیوڑھی سے بھرآئی، گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "اقبال احمد۔ اقبال احمد۔"

نسیمہ کے منہ پر مسرت اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے جلدی سے سر پر دوپٹہ درست کیا۔ اور پھر "اے دیکھنا رحیمن میاں بھائی ہیں میاں بھائی۔" کہتے ہوئے چارپائی سے نیچے اتری۔ سڑ پڑ سڑ پڑ جوتیاں پہنتی چار قدم آگے بڑھ کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔ رحیمن نے سمٹ سمٹ کر دوپٹہ سنبھالتے، ہنسی کے روکنے کے سو سو نخروں کے بعد ڈیوڑھی میں جھانکا۔ پھر اندر دبکیں سمٹیں، آدھی ٹیڑھی ہوئیں اور شیریں آواز نکالنے کی کوشش میں چیں چیں کر کے منمنائیں۔ "آیئے میاں اندر آیئے۔"

لمبا قد، سفید کپڑے، سیاہ چھدری ڈاڑھی، چوڑا چہرہ، سُرخی مائل گندمی رنگ ایک ہاتھ میں عصا دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ہینڈ بیگ۔ نسیمہ کے بھائی منشی کاظم حسین سب رجسٹرار تیزی سے گھر میں داخل ہوئے اور بیچ انگنائی میں

جھجھک کر مستقل طور پر ساکت کھڑے ہو گئے۔ نسیمہ نے مجبوراً تیسری دفعہ جھک کر تسلیم کی۔ نسیمہ کے بھائی نے باآواز بلند کلمہ پڑھا۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ نسیمہ گھبرا گئی۔ شرم و لحاظ کو قدرے پسِ پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھی۔ "خیر تو ہے میاں بھائی۔ میرے اللہ خیر تو ہے۔ کیا بات ہے میاں بھائی؟"

منشی کاظم حسین صاحب نگاہیں نسیمہ پر ایکساں جمائے ہوئے سیدھے ہی کھڑے کھڑے گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے ہوئے۔ عصا اور ہینڈ بیگ کو ملائمت سے زمین پر رکھ کر پھر ویسے ہی نگاہیں جمائے ہوئے آہستہ آہستہ سیدھے ہو گئے۔ دونوں ہاتھ اٹھائے، ملتے اور آنکھوں پر سے پھیرتے ہوئے ڈاڑھی کی نوک تک لائے اور پھر قرأت سے، شکراً الحمد للہ کہا۔

یہ سین شیریں فرہاد دونوں کے سوا سب کے لئے پُر ہیبت تھا۔ چنانچہ آگے آگے فرہاد اور ان کے پیچھے شیریں گھر کو چھوڑ زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر پہنچ گئے اور کئی گھنٹے واپس نہ آئے۔

اس عرصہ میں بھائی بہن میں کافی گفت و شنید ہو جانے سے قدرے پھر سکون پیدا ہو گیا۔ کاظم حسین نے بتایا کہ اس کو اقبال احمد کا تار ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اپنی بہن کا آخریِ دیدار کرنا ہے تو کر لو کیونکہ وہ حالتِ بیماری میں دم توڑ رہی ہے گھنٹوں کی مہمان ہے۔

نسیمہ نے اب اپنی پوری سرگزشت سنائی اور اقبال کیا کہ بیشک وہ اپنے خطوط میں ان کو صحیح حالات سے آگاہ نہ کرتی تھی اور بیشک بھائی کے بلاوے کے خط اس کو ملے۔ جن کا وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی زارو قطار روتے ہوئے ہچکیاں لے کر کہا۔ "میاں بھائی آپ جئیں ہزاروں برس، پھلیں پھولیں، خوشیاں کریں، بہوئیں لائیں۔ یہی میری دعا ہے۔ یہی میری تمنا ہے۔ لیکن سمجھئے تو یہی تو میرا گھر ہے جیتے جی اب اس کو کیسے چھوڑوں۔ اس گھر کی دہلیز پر میرا دم نکلے یہی میری آرزو ہے۔ قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اس گھر کو چھوڑوں تو دنیا

اور آخرت دونوں میں منہ کالا ہو۔ یہ میرا گھر ہے اس کو کیسے چھوڑ دوں؟"

کافی احتیاط اور بار بار آزمانے کے بعد یہ دونوں گھر میں تو آ گئے لیکن رات بھر سوئے ہوئے کاظم حسین کی ڈاڑھی اور ڈنڈے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے اور صبح اُن کے بیدار ہوتے ہی یہ دونوں پھر گھر سے بھاگ کوٹھے پر پہنچ گئے۔ اور کوٹھوں کوٹھوں پھرنے لگے۔ فرہاد نے برابر ہی کے دو منزلہ مکان کے زینے میں دھنی کے اندر چھپا ہوا گلہری کا ایک جھونجھ ڈھونڈھ لیا۔ یہ بڑا ہی پُر لطف مشغلہ تھا۔ شیریں اور فرہاد بار بار لکھوری اینٹوں کی دیوار میں پنجے جما کر دھنی تک چڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گئے۔ حالانکہ وہاں تک پہنچنا اُن کے لئے ناممکن تھا پھر بھی اُن کو دیوار پر چڑھنے اور گرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ کیونکہ گلہری خانم دیوار کی کانس پر بیٹھی دم پھلائے چرر چرر چر چرر ایکساں شور مچا رہی تھیں۔ اس لئے یہ دونوں اور خوش ہو ہو کر اُن کو اور ڈرا رہے تھے۔ لیکن اسی اثنا میں شیریں کو اپنے گھر میں بڑی پاٹ دار آوازیں جُھرجُھراتی اور تھرتھراتی سنائی دیں۔ فوراً اس کا دل کھٹکا۔ نسیمہ کی یاد آئی۔ سیدھی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اقبال احمد اور کاظم حسین گھر کے آنگن میں کھڑے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے پر زبانی حملہ کر رہے تھے۔ نسیمہ باورچی خانے کا کھمبہ پکڑے کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ رحیمن زمین پر اُکڑوں بیٹھی نسیمہ کی پنڈلی پر ماتھا ٹیکے رو رہی تھی۔ وہ مہینوں بلکہ برسوں بیوی کی خوشنودی کے واسطے حلیمہ دائی کے قصے پر نسیمہ کے ساتھ روتی رہی تھی۔ اس نے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دو آنے سیر کا نمک لا کر دیا تھا۔ لیکن یہ نجی اور پیشے کی باتیں تھیں۔ آج ان سب جذبات کو ایک طرف کر کے وہ دل توڑ کے رو رہی تھی۔ آج اس کا دل نسیمہ کی معصوم ہستی، نسیمہ کی پاک اور سچی ذات اور صرف ذات ہی سے جدا ہونے کے غم میں بیٹھا جاتا تھا۔

برآمدے میں گھڑونچی کے پاس عیدو کھڑے رو رہے تھے اور کٹورے پر کٹورا پانی کا پی رہے تھے۔ آج ڈور، کنکیوں، لٹو اور پھرکیوں کی محبت غائب ہو کر ایک

سچی اور پیاری سی ہستی، ماں سے بھی زیادہ مشفق دیوی کے چھٹنے کا غم اُن کو بیتاب کئے ہوئے تھا۔ اسی وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کی کتابوں کا جزدان بن جائے اور ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ چلا جائے۔ چونکہ یہ خیال بار بار ناممکن معلوم ہوتا تھا اس لئے پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اور بھر بھر کٹورے پانی پیتا تھا۔ شیریں کا بس نہ چلتا تھا کہ کیونکر اقبال احمد اور کاظم حسین دونوں کا ٹیٹوا چبا جائے۔ اس کو اس سے کچھ واسطہ نہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ایک دوسرے پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چلانا بہت ہی ناگوار تھا۔ وہ نسیمہ کے پیروں کے اِرد گرد بار بار پھرتی تھی اور بیکس ماؤں ماؤں کرتی تھی۔

سسکیاں، ہچکیاں، ماؤں ماؤں کچھ کام نہ آئے تو پھر یوں اُجڑا اور یوں اُجڑا نسیمہ کا چھوٹا سا گلشن جس میں بہار آتے ہی جا چکی تھی۔ جو برسوں سے پامال خزاں پڑا سنسان تھا۔ آج وہ بھی نہ رہا۔ چل چلاؤ۔ خاتمہ۔ خاتمہ!

کچھ سامان اِدھر سے اُدھر ہوا۔ کچھ اندر سے باہر، کچھ باہر سے اندر۔ مٹی کے چند گھڑے پھوڑے گئے۔ کچھ کاغذات پھاڑے گئے۔ کچھ پھٹے پرانے کپڑے پھاڑے گئے۔ کچھ بانٹے اور پھینکے گئے۔ چینی کے ٹوٹے برتن، خالی ٹین اِدھر اُدھر پھینکے۔ گھر کا کوڑا دوچند اور سہ چند ہوا یعنی نسیمہ کا اسباب بندھا اور ٹھیک ہوا۔ بند گاڑی کھڑ کھڑاتی آئی۔ سامان رکھا گیا۔ نسیمہ نے مڑکر اس سات برس پرانے قید خانے کو پھر دیکھا۔ آخری مرتبہ پھر اُبل کر روئی۔ شیریں کیا کرتی۔ ماؤں ماؤں کرتی ایکساں صدقے ہوتی تھی۔

کاظم حسین نے گھُرکا۔ "بس رُو چکیں۔ اب بھی دل نہیں بھرا۔ اُٹھو خدا کے لئے۔"

نسیمہ نے شیریں کو گود میں لے لیا اور بھائی کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل گاڑی میں سوار ہو گئی۔ جانوروں کو بھول جاؤ۔ اُن سے بے توجہ ہو جاؤ تو اس کا ان کو شکوہ نہیں ہوتا۔ محبت اور توجہ کرو تو وہ مشکور ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ شیریں کو آج پورے ایک برس کے بعد نسیمہ نے گود میں لیا تھا۔ اس کو اس کی انتہا سے زیادہ

خوشی تھی۔ حالانکہ گاڑی کی کھڑکھڑ اور ہل جل اور دھچکوں سے وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ لیکن نسیمہ ہی نے چمٹی بیٹھی رہی۔ اب گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ آیا۔ سامان اُترا۔ یہ لوگ اُترے۔ لیکن یہاں بے شمار آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے آ جا رہے تھے، اور اُن میں پچاسوں خوفناک کتے بھی پھر رہے تھے۔ شیریں کا نسیمہ کے بُرقعے کے اندر دم گھٹتا تھا۔ باہر اُن سب کو دیکھ کر دل دہلتا تھا۔ یہاں آ کر وہ پریشان تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ کدھر جائے اور کدھر چھپے۔ ایک دفعہ ہاتھوں سے نکل، کھوتی ہوئی نسیمہ کے پیچھے پہنچی۔ دو کتے اس پر جھپٹے۔ بیچاری بھاگی اور ایسی بھاگی کہ پھر نہ اُسے پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور نسیمہ کدھر ہے۔ فطرت کا تقاضہ تھا کہ چل اسی گھر کی طرف چل۔ عقلِ کوتاہ بھی یہی کہتی تھی۔ وہی گھر، وہیں بیوی ہوں گی۔ چنانچہ آٹھویں حواس کی مدد سے یہ روانہ ہوئی اور سیدھی گھر کی طرف چل دی۔

جس وقت وہ گھر پہنچی۔ دن کے دو بجے تھے۔ اِکا دُکا چیلیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بگولے چھت پر سے ہوتے ہوئے صحن میں اترتے تھے اور صحن کے کونے میں چکر لگا رہے تھے۔ یہاں کاغذ کے پُرزے جھاڑو کے تنکے، دونوں کے پتے بار بار اِدھر اُدھر سے لپک لپک کر گول گول چکر گھمنیاں کھاتے ہوئے چھت کی طرف اُڑتے تھے۔ اور پھر یاس اور حسرت کی حالت میں گر کر بے حس ہو جاتے تھے۔ گھر میں ہر طرف کوڑا تھا۔ باورچی خانہ کے سامنے کوئلہ کا گھڑا ٹوٹا پڑا تھا۔ کوئلے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ برآمدہ میں نسیمہ کی برسوں پرانی چارپائی برسوں پرانی جگہ سے دُور دو پاؤں پر دیوار سے لگی کھڑی، اوپر کے دونوں ہاتھ پھیلائے دُعا کی حالت میں گریاں معلوم ہوتی تھی۔ اُن کے پاس رحیمن کا ٹین کا پاندان خالی اور اوندھا پڑا رو رہا تھا۔ خاموش دنیا سے علیحدہ راہبوں کی سی زندگی بسر کرنے والے اس گھر کے تین نفر برسوں سے اس اُجڑے ہوئے گھر میں سب سے الگ تھلگ چپکے پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی طرح کا اُن کے وجود سے دُنیا پر کوئی بار نہ تھا۔ اور نہ یہ دُنیا میں مخل تھے۔ مگر آج وہ بھی نہ تھے ڈیوڑھی میں تالا پڑا

تھا۔ گھنٹوں شیریں اور فرہاد ماؤں ماؤں کرتے پھرے۔ مگر سب بے سود، شام ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا مگر اس گھر میں چراغ جلانے والا کوئی نہ تھا۔

اقبال احمد کی صورت سے ایک سے زیادہ دوسرے کو نفرت تھی۔ شیریں اور فرہاد دونوں اس کو حقیر اور ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ پرانے دوست نہ تھے نہ سہی گھر تو یہ اُن کا ہی تھا۔ اس ظالم کا کیا حق تھا کہ وہ اس طرح سے گھر میں گھس کر کھڑ بڑ کرتا۔ سامان اٹھاتا رکھتا پھرے ان دونوں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی بھگتنا پڑے وہ اس گھر کو نہ چھوڑیں گے۔ کمروں میں سامان کے پیچھے چھپے ہوئے یہ دونوں اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک اقبال احمد اُن کے پاس نہ آ جاتا تھا پھر دونوں وہاں سے بھاگ کر دوسرے کمرے میں اور سامان کے پیچھے جا چھپتے تھے۔ اقبال احمد پسینے میں شرابور منہ میں سگار دباتے میزوں اور کرسیوں کو گھسیٹتے چارپائیوں کو ڈھکیلتے، برتنوں کو کھڑکھڑاتے مسلسل دو گھنٹے تک پھرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کمروں میں تالے لگائے۔ گھر سے باہر نکلے، ڈیوڑھی میں تالا لگایا۔ اور ریلوے اسٹیشن پر بیٹھ کر گروہ میں آتے چل دیئے۔ یہ واقعہ نسیمہ کی روانگی کے دوسرے روز ہوا اور اس طرح شیریں اور فرہاد سچے عاشق اور معشوق کی طرح ایک ساتھ مرنے کے واسطے کمرے میں بند چھوڑ دیئے گئے۔

کچھ دیر تو اپنے اس طرح قید ہو جانے کی اہمیت کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ گھر میں خاموشی ہو جانے کے بعد انہوں نے کمرے کے بے ترتیب سامان میں چھلی چھلیا کھیلی۔ سامان جس قدر تتر بتر تھا اتنی ہی اُن کو اس سے دلچسپی تھی کیونکہ اس میں سے ایک آدھ چوہے یا چوہیوں کی کھسکساہٹ معلوم ہوتی تھی اور کبھی کبھی اُن کی جھانکتی ہوئی کھوپڑیاں ان کو نظر آتی تھیں۔ کافی جستجو کے بعد فرہاد نے ایک چوہا بھی پکڑ لیا اور جب اُسے اَدھ مرا سا چارپائی پر لایا تو برابر کی میز کے اوپر رکھی ہوئی کرسی پر سے شیریں نے جست کی اور چوہے کو چھین لیا۔ کچھ دیر تک

چھینا جھپٹی ہوا کی۔ لیکن اب شام ہو رہی تھی کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ختم برسات کی گرمی سے کمرے میں گھٹن معلوم ہوتی تھی۔ مرے ہوئے چوہے کو چھوڑ کر یہ دونوں دروازے کے پاس آ گئے۔ بار بار اس کے سامنے ٹہلے۔ پنجوں سے کھس کھسایا۔ کمرے میں چکر لگایا اور پھر دروازے کے پاس آ گئے۔ اس کمرے کا یہ ہی ایک دروازہ تھا۔ دوسرے راستے کی تلاش بے کار تھی۔ پھر بھی یہ کمرے میں رات بھر چکر لگا کر ساری رات اور دروازوں کی بھی تلاش کرتے رہے اور ہر چکر میں اس دروازے کی دراڑ میں ناک رگڑتے تھے۔ ان کو اس کمرے میں کھانے کے واسطے مطلقاً کچھ میسر نہ تھا۔ ایک کونے میں البتہ تانبے کی مٹکی میں پانی بھرا رکھا تھا اور اس کو چاٹ چاٹ کر باہر نکلنے کی بے سود کوشش میں متواتر پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوسرا دن بھی گزر گیا۔

بلیاں چوہے کا شکار شوقیہ کرتی ہیں اور صرف سرچبا کر اس کو پھینک دیتی ہیں ان کے مذہب میں چوہا کھانا جائز نہیں ہے۔ اب بھوک کے مارے یہ حالت ہو گئی تھی کہ روز گذشتہ کا مرا ہوا چوہا دونوں نے خوب کھایا اور اب جو پیٹ میں غذا پہنچی اور بھوک میں چوہے کے گوشت کی لذت معلوم ہوئی تو دونوں نے مل کر اب چوہے اور چوہیوں کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن افسوس کہ اُن کی بتیس گھنٹے کی متواتر موجودگی کی وجہ سے سب چوہے اور چوہیاں اس کمرے اور اس کمرے کے بلوں پر لعنت بھیج کر چل دیئے۔ غرض یہ کہ بھوکے پھرتے پھرتے ان کو چار دن اور چار راتیں ہو گئیں اب یہ دونوں کونوں کھدروں میں سے جھینگروں کی تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ صرف پانی زندگی کو کہاں تک برقرار رکھتا۔ جُوں جُوں وقت گذرتا گیا ان کی قوت زائل ہوتی گئی اب یہ دونوں کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ماؤں اور غاؤں کی صدائیں از خود نکالتے تھے۔ ان کے چکرائے ہوئے دماغ اور دھندلی آنکھیں ہر کونے میں انہیں جھانکتے ہوئے چوہے اور چوہیاں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ بار بار امید کی قوت پر اٹھ کر جاتے تھے اور پھر ڈگمگاتے ہوئے "ماعوں ماعوں" کی دم توڑ آوازیں نکالتے دروازے

کے پاس آجاتے تھے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا ہاتھ پیر اور حواس جواب دیتے گئے۔ آوازیں کمزور ہوتی گئیں اور اُن کے درمیان وقفے بھی زیادہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دسواں دن بھی گذر گیا۔ شیریں جو فرہاد سے کچھ دُور پڑی تھیں خاموش ہوگئیں۔ فرہاد اب بھی آدھ آدھ گھنٹے کے بعد نحیف "صعا" کی آواز نکالتا تھا۔ اس کی کمزور آنکھیں کبھی از خود روشنی سے منوّر ہو جاتی تھیں وہ چاروں طرف غذا کی تلاش کرتی تھیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ انہی آخری دم کے سنبھالوں میں اُس نے چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک طرف گوشت کا چھوٹا سا ڈھیر معلوم ہوا۔ پچھلے پیروں کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اگلے پنجوں کے سہارے آگے کھسکتا بڑھا مگر وہاں کیا تھا۔ دھوکا تھا۔ گوشت نہ تھا۔ اس کی محبوبہ شیریں کا خشک ڈھانچہ آخری اور کمزور سانسیں اب بھی لیتا ہوا موجود تھا۔ ہاں شیریں وہی شیریں تھیں۔ اس کو دیکھا، سونگھا، گھوما اور پھر اچھوں اچھوں پنجوں سے نڈھال دھڑ کو گھسیٹتا دروازے کی درا‌ڑ تک آیا۔ اور پڑ گیا۔ ایک ایک منٹ کئی کئی گھنٹے کے برابر تھا۔ چکر تھے، غنودگی تھی: پھر زندگی کی لہر سی دوڑی۔ خون میں ہیجان سا ہوا۔ آنکھوں میں بصارت آئی اور پھر وہی گوشت کا دھوکا ہوا۔ فرہاد پھر گھسٹتا ہوا اس طرف گیا مگر گوشت نہیں وہ تو شیریں تھی۔ اس نے سونگھا، بُو تھی، شیریں کی بُو تھی، اور شیریں کی بُو میں گوشت کی بُو تھی۔ اس نے چاہا پھر وہاں سے واپس ہو لیکن نقاہت نے مجبور کر دیا۔ اسی کوشش میں اس کا سر بے قابو ہو کر جھجھ سے زمین پر گرا۔ بیہوشی سی چھا گئی اور پھر جب ہوش آیا تو گوشت کی بُو آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شیریں کا تن لاغر اب بھی بقیدِ حیات تھا۔ دفعتہً فرہاد کے نامکمل حیوانی دماغ نے شیریں اور غذا دونوں کو ایک ہی نقطۂ خیال میں وابستہ کر دیا۔ ایک ایک انگل آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر بڑھایا۔ جبڑا کھولا اور شیریں کا گلا دبایا اُس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، فرہاد کو دیکھا اور آخری مرتبہ خفیف "ماؤں" کی آواز نکالی۔ فرہاد نے پورا زور لگا کر تیز دانت شیریں کے نرخرے میں گھسا دیئے اور پھر ساکت سا ہو گیا۔ اس سے زیادہ قوت اب اس میں نہ تھی۔ رِستے رِستے سُوکھے ہوئے خون کی چند

بوندیں نکلیں، زبان پر آئیں۔ ڈو ڈو بوند اور دو دو بوند خون اس کے حلق سے اُترا اور آہستہ آہستہ قوت کا ہیجان فرہاد کے دست و پا میں پیدا ہوا۔ اب اُس نے گوشت بھی کھایا قوت آئی۔ پیاس معلوم ہوئی۔ مٹکی میں سے جاکر پانی پیا۔ آنکھیں کھل گئیں، ہاتھ پیروں میں جان آگئی۔ اصلی تڑپتی ہوئی بھوک از سرِ نو پیدا ہوئی۔ اب یہ معمول کی غذا کی طرح شیریں پر جُھک گیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد چند ہڈیوں کے سوا شیریں کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

طویل فاقے کے بعد شکم پُر فرہاد نشہ کی حالت میں ایک صندوق پر بیٹھ کر نیند کے جھونکے لینے لگے۔ اور ابھی اسی حالت میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر گھر میں کھٹ پھٹ ہوئی۔ اقبال احمد اور چند ملازموں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس کمرے کے دروازے کی کنڈی کھٹکی۔ دروازہ کھلا۔ تھکے نشے میں چُور، کمزور اور پیٹ پھولے ہوتے فرہاد بادلِ نخواستہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ڈگمگاتے، جھومتے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر چل دیئے۔

عرصے تک لوگوں نے بدہیبت، سیاہ، دُم کٹے بلے کو بھیانک آوازیں نکالتے دیواروں دیواروں پھرتے دیکھا۔ عقل اور حافظ سے مجبور فرہاد اس واقعے کے بعد مدتوں شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں، گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔

فرہاد، اے حیوانی فرہاد، ناشنیدہ ظلم کے بانی فرہاد، تیری ہستی قابلِ قدر ہستی ہے۔ شیریں کی موت کتنے ہی بُرے پہلو سے کیوں نہ دیکھی جائے وہ ایک موت تھی جو آناً فاناً میں آگئی جس کے مصائب وہیں ختم ہو گئے۔ مگر آہ نسیمہ تجھ کو موت کب آئے گی۔ تیری مصیبتیں کب تک ختم ہوں گی تو کب تک بھائی کے گھر میں روٹیاں تھوپے گی۔ برتن مانجھے گی اور کب تک بدمزاج ضدی بھتیجے بھتیجیوں کے زیرِ مشق رہے گی۔

قصّہ نہ کہانی

جنگل کے کنارے چار جھونپڑوں کا ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ خود ہی اپنا پیٹ پالتی تھی۔ بجھڑے کی دو روٹیاں کھانے کو گاڑھے کی ایک دھوتی پہننے کو۔ بس یہ زندگی کی ضرورتیں تھیں۔ مگر نہیں، یہ گھر بھوتوں سے خالی نہیں رہتا۔ بڑھیا کے دل میں بھی ایک حسرت تھی وہ اکثر سوچا کرتی تھی اگر میرے پاس ایک بھینس ہوتی تو......!

بڑھیا کی ان باتوں پر ایک روز ان کو ہنسی آگئی...... حکم دے دیا۔ ایک فرشتہ آدمی کا بھیس بدل کر آیا اور موٹی گول بھینس بڑھیا کو دے کر چلا گیا۔ اب تو بڑھیا باغ باغ ہوگئی۔ بھینس کے واسطے اس نے ناند بنائی۔ کھونٹا گاڑا۔ ایک رسّی بٹی اور ایک چھپر بھی ڈلوایا ہر وقت وہ بھینس ہی کی فکر میں لگی رہتی۔ چرانے کو لے جاتے۔ دونوں وقت ندی میں نہلائے، راتوں کو دھواں کرے کہ مچھر نہ ستائیں۔ جس دن بھینس بیمار ہوئی تو اس نے نظر گزر کے ٹیکے اس کے ماتھے پر لگائے، کالی مائی کا پوجا کیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھینس نے دونوں وقت ملا کر آٹھ سیر دودھ دینا شروع کر دیا۔ اب تو بڑھیا کے گھر میں رکھنے کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کہیں دودھ اونٹ رہا ہے، کہیں مٹھار کھا ہے، کہیں دہی رکھا ہے، مٹکیاں گھی کی بھری رکھی ہیں۔ مہینہ پیچھے جب اس گاؤں کے لوگ ھاٹ میں جائیں تو اس کا گھی لے جا کر اس کے بدلے میں چمکتے ہوئے روپے لاکر اسے دے دیں۔ یہ ان کو گن گن کر زمین میں دبا دے اور بھینس

کے کان میں جا کر کہے "بھنا پورے ڈیڑھ بی سی کر دے تا جونوں" بھینس جگالی روک کر سنے اور پھر جگالی کرنے لگ جائے۔ اور من ہی من میں کہے "بڑھیا اچھی ہے مجھے چاہتی ہے"۔ اس طرح دونوں میں محبت بڑھتی گئی۔ لیکن پڈا دبلا ہی ہوتا چلا گیا۔ بھینس میں عقل بھی موٹی ہوتی ہے۔ بہت دن کے بعد جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ کیا بات ہے۔ اب اس نے دودھ چرانا شروع کر دیا۔ بڑھیا کو یہ بات ناگوار ہوئی، مگر کر بھی کیا سکتی تھی۔ البتہ اس نے بھینس کی نگہداشت میں اور زیادہ جفاکشی شروع کر دی۔ جتنی دیر بھینس چرتی بڑھیا اس کے رات کے واسطے چارہ جمع کرتی۔ صبح سانی دیتی۔ دن بھر چراتی رات کو ناند بھر کر گھانس دیتی۔ کبھی کبھی جھڑے کی ایک روٹی بھی اسے کھلاتی۔ ایک دن کلکٹر صاحب شیر کے شکار کو نکلے۔ شیر کے واسطے پڈوں کی ضرورت تھی۔ ایک چپراسی نے آکر بڑھیا کے پڈے پر قبضہ جما لیا۔ اور بارہ آنہ پیسے جن میں ایک کھوٹی چونی بھی تھی بڑھیا کو دے کر پڈا چھین لیا۔ شام جب بھینس اپنے چھپر میں آئی اور پڈے کو نہ پایا، بہت گھبرائی۔ رات بھر پکار کی، نہ جگالی کی نہ دودھ اترا، بڑھیا بھی بہت پریشان تھی۔ دم دلاسے کی باتیں بھی کرتی تھی۔ کہیں سے نمک مانگ کر لائی، وہ بھی دیا۔ پھر بھینس کے دل پر زخم تازہ تھا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تین دن میں بڑھیا نے سب جتن کر ڈالے۔ دنیا بھر کی ترکیبیں کیں۔ ٹوٹکے ٹونے، سب کئے آخر تیسرے دن ڈیڑھ کوس چل کر کلندر بھکیر سے چار آنے کا تاویج لائی، وہ بھینس کے سینگھ میں ڈالا جب جا کر بھینس نے دودھ دیا۔ دیا کیا بلکہ دینا شروع کیا، آٹھ دس دن بعد دودھ تو دینے لگی، لیکن کبھی تین سیر، کبھی چار سیر، بڑھیا نے چری کی کٹی۔ گیہوں کا بھوسا، ہری گھانس سب ہی کچھ دینا شروع کر دیا۔ زمین میں سے کھود کھود کر چار روپیہ بھی خرچ کر ڈالے۔ مگر دودھ نہ بڑھا۔ بھینس دل ہی دل میں کہے۔ "بہنا اب دودھ مورے بس میں ناہیں"۔ بڑھیا سانی دے کر گھنٹوں بھینس کی گردن سہلاتی اور اس سے باتیں کرتی۔ اور بھینس بھی محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا کرتی۔ اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے ایک دن شام کو جنگل کے کنارے یہ دونوں گئے کہ پاس ہی کے سال بنی کے جنگل میں سے نالے کے کنارے سے شیر ڈڑکا۔ دونوں بھاگے۔ بڑھیا بھی بھاگی اور بھینس بھی بھاگی۔ نہ اس سے بھاگا گیا نہ اس سے۔ جوں توں دونوں گھر آئے۔ رات بھر بڑھیا کو نیند نہ آئی اور بھینس

سے جگالی نہ ہوئی۔ صبح کو اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور اس کو بخار تھا۔ دو ایک دن بعد جب دونوں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئے تو بھینس کا دودھ اور سوکھ گیا تھا۔ اب ڈیڑھ ہی سیر رہ گیا تھا۔ کچھ دن بڑھیا نے کوشش کی جب دودھ نہ بڑھا تو کوشش چھوڑ دی۔ جب کوشش چھوڑی تو دودھ اور کم ہو گیا۔ اور جب دودھ اور کم ہو گیا تو سانی چارہ سب موقوف ہو گیا۔ ادھر بڑھیا کو رنج تھا ادھر بھینس کو، دن بھر گاؤں کے کنارے الٹی سیدھی گھانس چر کر آئی، تو سیر آدھ سیر دودھ اترتا۔ کچھ دن بعد یہ بھی سوکھ گیا۔ یہاں تک کہ بڑھیا نے دُوھنا بھی چھوڑ دیا۔ اب بھینس اکثر بھوکی رہا کرتی۔ کچھ دن بعد کٹکٹاتے جاڑے آ گئے۔ گھانس کا نام تک نہ رہا۔ بھینس کو فاقے پر فاقے گزرنے لگے۔ بڑھیا نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ برسات کا گرا پڑا چھپر تھا اس کے نیچے اپنے آپ بھینس آکر بیٹھ جاتی.... ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ راستہ چلنا مشکل تھا۔ پیٹ ظالم ہے۔ ایک دن گھانس کی تلاش میں ندی کے کنارے کنارے بہت دور نکل گئی۔ ایک جگہ کیچڑ اور پانی سے گھری ہوئی کچھ گھاس نظر آئی۔ تیرتی، کیچڑ میں پھنستی یہ بیچاری اس تک پہنچی اب جو سونگھا تو کھانے کی نہ تھی بمشکل تمام واپس نکلی اور ساتھ میں ایک بھینسیا جونک بھی اپنی بغل میں لٹکائے لے آئی۔ سیدھی گھر کی طرف چلی کہ بڑھیا دیکھ کر چھوڑ دے گی، لیکن اب بڑھیا نے اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہی ہوا کہ جب جونک نے پورا ڈھائی سیر پکا خون پی لیا اور پونے دو فٹ لمبی ہو گئی جب جا کر پیچھا چھوڑا۔ خیر جونک تو چھٹ گئی لیکن جونک کا زخم رہ گیا۔ اول تو بڑھیا اب اس کی طرف سے بے خبر ہی تھی۔ پھر زخم تھا بغل میں، اندر ہی اندر ناسور ہو گیا کیڑے پڑ گئے۔ بھینس کا وقت آ گیا۔ ایک دن جو مرتی کھپتی چرنے گئی تو پھر واپس نہ آئی۔ ندی کے قریب پیپل کے درخت کے نیچے اس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ چاروں پیروں پر بیٹھ گئی۔ خود اٹھنے کی سکت نہ تھی سر اونچا کئے بیٹھی تھی۔ گزشتہ زندگی کے واقعات نظروں کے آگے تھے۔ دل کا انجن آخری جدوجہد میں مصروف تھا کہ ایک پرانا دوست نظر آیا۔ بھائی کالے نے کائیں کائیں کی دو آوازیں لگائیں اور پیٹ پر اترے، پھر پھدک کر سر پر آئے، پھر کان کے پاس۔ بھینس سوچنے کی کوشش کرنے لگی کہ

یہ سچا دوست ہے۔ کوے نے کہا۔" کوں کالی اماں ہم نہ کہتے تھے۔ آدمیوں کو بھینس کی محبت نہیں ہوتی۔ دودھ کی محبت ہوتی ہے۔" بھینس نے بڑی کوشش سے لمبا سانس لیا اور کوّے کی طرف احسان مندانہ آنکھ اٹھائی۔ کوّا بولا، "کالی اماں سچ تو یہ ہے کہ "مجھے بھی تم سے محبت نہیں۔ بلکہ تمہارے کان کی کلیتوں سے محبت ہے۔ لاؤ دو چار اور کھالوں۔" بھینس کا دل ضرور بڑا بہت بڑا ہوتا ہے لیکن وہ بھی بیٹھ گیا۔

[illegible]